اور نتائجی طریقۂ کار تھا جس میں سیاستدانوں سے مقابلہ نہیں ہوتا تھا۔ اور ان کی کامیابی نے ان کو صحیح ثابت کر دیا تھا، جیسی کہ وہ اور ان کے ساتھی سمجھتے تھے، اسی میں اپنے ملک کی بھلائی بھی تھی۔

ایک مرحلے پر وہ آبادیات کے محکمے کے ذمے دار تھے اور ہندوستانی حکومت سے ہجرت کرنے والوں کی جائیداد کے حتمی مالی لین دین کے طے کرنے میں آلۂ کار رہے تھے۔ اس مرحلے پر ان کی دیانت، اُجلے پن اور غیر جانب داری کا کڑا امتحان تھا۔ انھوں نے خود کو کھرا ثابت کر دیا جب ان کو ان کی جائیداد کا معاوضہ صرف ایک لاکھ روپے ملا۔ جتنی جائیداد وہ ہندوستان میں چھوڑ کر آئے تھے اس کے مقابلے میں یہ رقم کچھ بھی نہ تھی جب کہ، جیسا کہ سب کو علم ہے، لوگوں نے خوب دولت بنائی تھی۔ مگر انھیں اس کی بالکل پروا نہیں تھی۔ ان کے نزدیک وہ سب تاریخ تھی، ماضی تھا۔ اتنی بڑی جائیداد کے چلے جانے نے ان کو کبھی کبیدہ خاطر نہیں کیا۔ ترقیات، تصورات، نئی نسل کے لیے مواقع، ملک کے لیے ایک روشن مستقبل، بس یہی کچھ ان کے ہدف تھے اور دن رات، اپنی ذاتی زندگی سے لا پروا، وہ اسی کے حصول کے لیے کوشاں رہتے۔ ان کی بیوی اور سات بچے، سب ۱۹۵۴ء میں کراچی چھوڑ کر انگلستان چلے گئے اور اپنے خوب صورت مکان Seven Bricks (ہر بچے کے نام کی ایک اینٹ) میں عباس خلیلی کنواروں کی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے۔

اس طرح ان کے پاس بہت وقت ہوتا تھا جس کو وہ اپنے ملک اور اپنے دوستوں کے لیے وقف کیے ہوئے تھے۔ اگرچہ سول سروس کے لیے ان کی تربیت نظم و ضبط اور اخلاقیات کے کڑے اُصولوں کی پاسداری پر ہوئی تھی مگر وہ کسی بھی مسئلے کے حل کے لئے نتائجی انداز میں سوچتے اور حل نکالنے کی کوشش کرتے۔ کوئی بھی اڑچن آ جائے، کسی سرکاری افسر کی انا کا مسئلہ ہو، عباس جیسا مددگار دوست ہمیشہ خدمت کے لیے حاضر۔ وہ قانوں کو کبھی موڑتے نہیں تھے مگر ان کی کوشش ہوتی تھی کہ 'سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے'۔ اگر آپ تاجر قوم کو صنعت کار بنانا چاہتے ہیں تو ان سب کو، جو کارخانے چلاتے ہوں، قید کر کے چابی کہیں دور نہیں پھینک سکتے۔ اگر آپ ترقی دیکھنا چاہتے ہیں تو آپ کو لوگوں کو لبھانے کے لیے بھی کچھ کرنا ہوگا، صرف ڈنڈے ہی سے کام نہیں نکلتے۔

ظاہر ہے، خلیلی اچھی طرح جانتے تھے کہ نئے نویلے صنعت کار غلط کاری میں ملوث ہیں، اور بہت کچھ کرتے ہیں جو قانون اور قاعدے کے مطابق نہیں ہوتا مگر ان کو یہ بھی اچھی طرح معلوم تھا کہ کچھ ایسے دیوانے بھی ہیں جن کو اگر تحفظ دیا جائے، مواقع فراہم کیے جائیں، ان کی کارکردگی پر نظر رکھی جائے، غلطی پر فہمائش بھی کی جائے مگر ایسی بھی نہیں کہ ان کو برباد کر دے، تو ترقی بھی ہوگی اور ملک کا مقدر ایک تابناک معاشیاتی مستقبل ہوگا۔

ان سب خصوصیات نے ان کو بے حد مقبول بنا دیا تھا۔ اس قدر کہ جب ۱۹۵۸ء میں ایوب خان نے ملک کا انتظام سنبھال لیا تھا، ان کو وزارتِ تجارت کا سیکریٹری بنا دیا گیا تھا، جس کی باگ ڈور ذوالفقار علی بھٹو جیسے کم عمر وزیر کے سپرد تھی۔ انھوں نے اس نوعمر وزیر کو بہت ذہین، من چلا مگر، مہذب پایا۔ جب بھی خلیلی ان کے دفتر میں داخل ہوتے وہ احتراماً کھڑے ہو جاتے۔ ان کی موجودگی میں وزیر صاحب نے کبھی بدتمیزی کا مظاہر نہیں کیا۔ خلیلی نے خود اس ایک برس کے عرصے کو اپنی ملازمت کا سب سے خوش گوار وقت کہا ہے۔ خلیلی صاحب کو ایوب خان کی مکمل پشت پناہی حاصل تھی جن کو وہ ۱۹۵۴ء سے جانتے تھے جب ان کو وزارت دفاع کے سیکریٹری کے طور پر مانگا گیا تھا، بعض وجوہ کی بنا پر جو ممکن نہیں ہو سکا تھا۔ یہ ایوب خان کی مکمل پشت پناہی تھی جس کی وجہ سے خلیلی صاحب نے کامیابی سے بونس ووچر اسکیم کا نفاذ کیا تھا جو German Bundesbank کے سابق صدر Herr Vocke نے تجویز کیا تھا تا کہ ملک میں طاقت ور برآمدی صنعت کا نظام قائم ہو سکے۔ عالمی بینک کے سابق افسر اور اس وقت کے وزیرِ مالیات شعیب صاحب لاتعلق، مزاحم، اور منصوبے کے خلاف تھے مگر خلیلی صاحب نے ایوب خان کی آشیر باد حاصل کر لی جنھوں نے کہا تھا، ''اگر آپ اس کو سمجھتے ہیں تو بسم اللہ۔ شروع کیجیے۔'' اس کو وقعت کہتے ہیں۔ ایوب خان کے دور میں ان کو ایک برس تک، جب وہ ملازمت میں رہے نا قابلِ مثال اختیارات حاصل تھے۔ مگر اتنے سارے اختیارات، اتنے

سارے دوست تھے تو، حسد اور رقابت تو ہونی ہی تھی۔

۱۹۵۹ء میں ان بارہ آئی سی ایس افسروں میں سے، جنھوں نے امیدوں کی اس نئی مملکت کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنے اور چلانے کی نیت سے ہندوستان میں اپنے گھر بار چھوڑے تھے، گیارہ کو مارشل لا کے افسران نے گھر بھیج دیا۔ ایوب خان نے نہیں، نہ فوج کے جنرلوں نے، بلکہ ایک مختصر سی کمیٹی نے۔ فیصلے کی بنیاد ایسی مبہم وجوہات تھیں کہ پاکستان کی اہم شخصیات کے نزدیک یہ ایک سانحہ تھا جو مستقبل میں ملک کی ترقی کے لیے بڑی رُکاوٹ تھا۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ پردہ اندازی (screening) کا یہ عمل خالصتاً رشک وحسد کی شہ پر اور مردم آزاری کے جذبے کے تحت کیا گیا تھا۔

خلیلی صاحب پر یہ الزام تھا کہ انھوں نے طاقت کے غلط استعمال سے گروہ بندی کی اور اپنا ذاتی حلقۂ اثر بنالیا تھا۔ یہ بھی کہ ٹیکس اور کسٹم ڈیوٹی کی ادائیگی سے صنعت کاروں کے انکار کی جزوی ذمے داری ان پر عائد ہوتی تھی۔ انھوں نے الزام کے جواب میں کہا تھا، ''میرا کام صنعت کی وزارت کے سیکریٹری کی ذمے داریاں نبھانا تھا۔ میرا کام بنانا تھا۔ مجھے اس فرض کی ادائیگی کے لیے لوگوں کو اکٹھا کرنا اور ان کو ترقیات کے لیے ترغیبات دینا تھا جو محنت کرنے پر راضی تھے۔ مجھے ایک ولیکا کی اس لیے حمایت کرنی تھی کہ وہ ایک کارکن تھا، ایک فینسی کی اس لیے کہ وہ بھی ایک کارکن تھا، مجھے ان سب کی امداد کرنی تھی اس لیے میرا کام پاکستان کو بنانے میں مدد کرنا تھا۔ میرا یہ کام نہیں تھا کہ میں ان سے ٹیکس وصول کروں۔ یہ کام وزارتِ مالیات کا تھا۔'' یہ سب کچھ وہ عموماً کہا کرتے تھے۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ ان کا فرض تھا کہ ملک آگے بڑھے، اور ان لوگون کے خلاف اخلاقی فیصلے کرنا ان کا کام نہیں تھا جو ایک ہمالیائی کوشش میں ان کا ساتھ دے رہے تھے۔ انھوں نے کبھی کسی کی جانب داری نہیں کی۔ انھوں نے کبھی کسی بھی نسلی گروہ کو ترقی کرنے سے نہیں روکا۔ جنوبی ہندوستان سے حئی سنز کے، میمن آدمجی اور ولیکا کے آغا خانی امیر علی فینسی کے اور پنجابی سہگل کے راستے داخل ہوئے تھے۔

اور اگرچہ سب جانتے تھے یہی سب کچھ سچ ہے، اور باوجود اس کے کہ طاقت کے اس مرکز میں ان کے بھی کئی دوست شامل تھے، ان کو اس لیے جانا پڑا کہ وہ اس حلقے میں شامل تھے جس کو بہرحال فارغ کیا جانا تھا، کہ وہ بہت طاقت ور ہوتا جارہا تھا۔

فارغ کیے جانے والے ساتھیوں میں سے کچھ اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ وہ ملک چھوڑ کر چلے گئے۔ کرامت اللہ کی تلخی کبھی نہیں گئی۔ وہ انگلستان چلے گئے تھے مگر انتقال سے کچھ دنوں قبل پاکستان واپس آگئے تھے۔ انھوں نے وصیت کر رکھی تھی کہ وہ پاکستان میں دفن نہیں ہونا چاہتے تھے۔ اس لیے کہ وہ اپنی قبر کے لیے اس ملک کی زمین غصب نہیں کرنا چاہتے تھے جس نے ان کو رَد کر دیا تھا۔ ان کا جسدِ خاکی انگلستان بھیج دیا گیا تھا جہاں وہ دفن ہوئے۔

غیر معمولی حد تک رجائیت پسند خلیلی نے نجی شعبے میں قسمت آزمائی کی، اپنی صنعتیں اور کئی ادارے قائم کیے۔ ان میں مشہور ادارے کینیڈا ڈرائی، ایسوسی ایٹڈ کنسلٹنگ انجینئرز تھے۔ چٹاگانگ میں تیل صاف کرنے کا کارخانہ ایسٹرن ریفائنری کے نام سے قائم کیا جس کے ساتھ برما ایسٹرن کے نام سے تیل کی فروخت کا ایک مربوط نظام قائم کیا جس کے وہ چیئرمین بنے۔ یہ ایک بڑا منصوبہ تھا جو شاید ان کی زندگی کا سب سے اہم کام تھا۔ اس وقت کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ ملک کے دونوں بازوؤں کے علیحدہ ہونے کی پیشین گوئی کرسکتا جس کے باعث اپنی ذاتی زندگی میں ایک بار پھر عباس خلیلی ایک بڑے نقصان سے گزرے۔ یہ منصوبہ زور شور سے اپنی کامیابی کی طرف گامزن تھا اور وہ اس کی ممکنہ کامیابی کے بارے میں بہت پُر امید تھے کہ دسمبر ۱۹۷۰ء میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا روح فرسا واقعہ رونما ہوا اور خلیلی صاحب کو وہاں سے نکلنا پڑا۔ انھوں نے اس واقعے کو بڑی بہادری سے سہا مگر مجھے یقین ہے کہ اپنی تنہائیوں کے لمحات میں انھوں نے زندگی کے بدنما رُخوں اور اس کی منطق بارے میں ضرور سوچا ہوگا کہ ہندوستان کے تناظر میں وہ جس مقام کے حق دار تھے، وہ ان کے مقدر میں نہ تھا۔

بہرحال ایسٹرن ریفائنری کی تکمیل سے کچھ برس پہلے ۱۹۶۰ء میں ایک اور واقعہ ظہور پذیر ہوا جو ان کی تہ در تہ صلاحیتوں کے لیے

ایک بڑی للکار سے کم نہ تھا۔ مشرقی پاکستان کے ایک بڑے، بارسوخ صنعت کار اور خلیلی صاحب کے پُرانے دوست مرزا احمد اصفہانی نے، جن کے بھائی حسن، قائدِاعظم کے معتمد ساتھیوں میں سے ایک تھے، پاکستان کی سب سے بڑی بیمہ کمپنی، ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی، کی ڈوبتی کشتی کو پار لگانے کے لیے ان کی امداد چاہی تھی، جس کے دگرگوں احوال سے اس وقت تک صرف چند ہی لوگ واقف تھے۔ 'بڑا صاحب' چاہتے تھے کہ وہ (یعنی خلیلی صاحب) پاکستان کی سب سے بڑی مقامی کمپنی کے حالات کو درست کرنے میں مدد دیں۔ اس کمپنی کے صدر دفاتر قمر ہاؤس میں تھے، جو پورٹ ٹرسٹ کی عمارت سے بالکل متصل تھی۔ صنعتِ تعمیر کے اعتبار سے قمر ہاؤس ایک بڑی اثر انگیز عمارت تھی بحری جہاز سے کراچی آنے والے لوگوں کا جس سے پہلا واسطہ پڑتا تھا۔ کمپنی کی مالی حالت اور اس کی وجوہات کے بارے میں ایک مختلف باب میں تفصیلات بیان کی جاچکی ہیں۔ اصفہانی خاندان ایسٹرن فیڈرل کے ابتدائی دنوں سے اس سے منسلک تھا اور مرزا احمد اصفہانی، عبدالرحمٰن صدیقی صاحب کے بعد، جو کمپنی کے مؤسسین میں سے تھے، اس کے چیئرمین بن چکے تھے۔ اصفہانی خاندان کے پاس ای ایف یو کے اکثریتی حصص تھے اور اگرچہ 'بڑا صاحب' ۱۹۵۱ء میں چیئرمین کا عہدہ چھوڑ چکے تھے اور ان کی جگہ جناب غلام حسین شیرازی لے چکے تھے، پھر بھی کمپنی کے مسائل میں وہ ذاتی دل چسپی رکھتے تھے۔

۱۹۵۰ء کے عشرے میں ای ایف یو کے لندن میں ہونے والے نقصانات اپنے عروج پر پہنچ رہے تھے۔ کمپنی کے جنرل منیجر جناب کے ایف حیدر لندن کے قرض خواہوں کو منانے میں اپنی کوششیں تمام کر چکے تھے۔ ساری کوششیں بے کار ثابت ہو چکی تھیں۔ حیدر صاحب اس بھونچال کے عین وسط میں کمپنی چھوڑ کر پاکستان انشورنس کارپوریشن میں جا چکے تھے۔

عباس خلیلی نے پہلے تو سارے معاملے کا خود تجزیہ کیا اور بعد میں اپنے پرانے ساتھی عثمان علی سے مشاورت کی، جو ان دنوں وزارتِ تجارت میں سیکریٹری تھے۔ خلیلی صاحب نے اس مشکل چیلنج کو قبول کیا مگر اس شرط پر کہ اصفہانی خاندان کمپنی پر اپنے غلبے سے دست بردار ہو کر روشن علی بھیم جی کو حیدر صاحب کی جگہ جنرل منیجر بنانے پر راضی ہوگا۔

اپنے حصص کی فروخت، اس پر غلبے سے دست برداری اس لیے ضروری تھی کہ اس نوع کے مالی ادارے کو ایک وسیع ملکیتی ادارے کی صورت میں نئے سرے سے جمایا کیا جائے۔ خلیلی صرف ایک شخص یا خاندان کی ملکیت کے مقابلے میں جو کمپنی کو اپنی خاندانی جائیداد کی طرح چلا رہا ہو، وسیع ملکیتی کیفیت کو، پاکستان کے تناظر میں بہتر سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں پیشہ ور ماہرین کے ہاتھوں انتظام ممکن نہیں ہوتا اگر ادارے پر کسی خاندان کی اجارہ داری ہو اور وہی اس کے بارے میں فیصلے کر رہا ہو۔ جہاں وہ اکیلے فیصلے کرنے والے کی حیثیت میں ہوں تو اپنے بارے میں بھی وہ اسی طریقے کو بہتر جانتے ہیں۔ اسی لیے ایسٹرن ریفائنری میں انھوں نے مختلف مقامات سے دس مختلف حصص ملکیت رکھنے والوں کو ڈائریکٹر کی حیثیت سے شریکِ کار کیا تھا۔

'بڑا صاحب' کو اگرچہ ایسی صورتیں پسند نہیں ہوتی تھیں مگر اس مقام پر ان کے لیے کوئی چارۂ کار نہیں تھا سوائے اس کے کہ خلیلی صاحب کی شرائط کو قبول کر لیں۔ روشن علی بھیم جی کا تقرر بھی خلیلی صاحب کی شرائط کا حصہ تھا۔ اصفہانی خاندان کے لوگ اس شرط کے بارے میں بہت خوش نہ تھے اس لیے کہ وہ بھیم جی کو اچھی طرح جانتے نہ تھے۔ مگر بھیم جی کے بارے میں، ان کے سیاسی پس منظر ان کے دوستوں کی تفصیلات وغیرہ کی جو معلومات ان کے سامنے آرہی تھیں ان کے پیشِ نظر ان کو اس کڑوی گولی کو فوراً نگل لینا ذرا مشکل تھا۔ عثمان علی، بھیم جی سے اچھی طرح واقف تھے اور کسی حد تک خلیلی بھی انھیں جانتے تھے اور ان کو ایک وسیع النظر اور کرشماتی شخصیت کا حامل سمجھتے تھے۔ ایک شخصیت جو اپنی ابلاغی ہنرمندی اور پیشہ ورانہ صلاحیت کے لیے مشہور تھی۔ یکم جنوری ۱۹۶۱ء کو ایک معاہدہ طے پا گیا، خلیلی اور بھیم جی نے ای ایف یو کی زمامِ اقتدار سنبھال لی اور کمپنی کی کشتی کو طوفان سے نکالنے کے چیلنج کو قبول کر لیا۔ اصفہانی خاندان کے فروخت کیے جانے والے حصص بھیم جی سے قربت رکھنے والے ARAG خاندان نے خرید لیے اور کچھ حصہ عوام میں فروخت کر دیا گیا۔

سب سے پہلا کام جو بھیم جی اور چیئر مین خلیلی کے سامنے تھا وہ لندن کے قرض خواہوں سے معاملہ طے کرنا تھا۔ دونوں میونخ کے راستے لندن کے لیے عازمِ سفر ہوئے۔ بھیم جی پہلے جرمنی گئے جہاں کمپنی کے ری انشورر میونخ ری سے ملاقات طے تھی۔ غیر متوقع اور ن امیدی کے کیفیت تھی پھر بھی ان کو میونخ ری میں خوش آمدید کہا گیا اور بال آخر میونخ ری نے کمپنی کے نقصانات کو پورا کرنے کے لیے مالی امداد کا وعدہ کرلیا۔ اس وعدے کے ساتھ وہ لندن پہنچے۔

خلیلی کے صاحب زادے کی یادوں میں اتنا تھا کہ وہ سردی کا موسم رہا ہوگا اس لیے کہ خلیلی صاحب اوورکوٹ میں نکلتے تھے اور اسی میں واپس گھر آتے تھے۔ ''مجھے یاد ہے کہ یہ سردی کا زمانہ تھا اور فضا میں برف باری کی مہک رچی ہوئی تھی۔ میں ان دنوں اسکول میں تھا اور اتنا یاد ہے کہ وہ لوگ چار یا پانچ دن آتے جاتے رہے تھے۔ لندن میں یہ ایک مختصر قیام تھا خاص اس مسئلے کے لیے۔ والد صاحب بہت پُرسکون نظر آتے تھے اور ان کا کہنا تھا کہ جب آپ کی پشت دیوار سے لگی ہوئی ہو تو آپ کو صرف آگے ہی جانا ہوتا ہے۔ اور اپنے بچاؤ کے لیے ایک واضح تصویر کی ضرورت ہوتی ہے۔ سو، لندن کے قرض خواہوں کے لیے ایک سادہ سی تجویز تھی 'اسے قبول کیجیے یا سب کچھ بھول جائیے'۔ اور اگر آپ اس کو قبول نہیں کرتے تو پھر ہم ختم اور کچھ بھی باقی نہیں رہے گا، بس یہی ایک حقیقت ہوگی۔ اور اگر آپ راضی ہیں تو آنے والے برسوں میں ہم دونوں کو ایک ساتھ مل کر کام کرنے کا موقع بھی ملے گا اور آپ ہم سے کچھ کما بھی سکیں گے۔ مگر ہماری موت کی صورت میں آپ کو کچھ بھی نہیں ملے گا۔ اس طرح انھوں نے ہم لوگوں کو حالات سے آگاہ کیا تھا۔ لندن کے قرض خواہوں نے تجویز کو قبول کر لیا، خاصی رقم معاف کردی اور اپنے تعلقات کو دوبارہ استوار کرلیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ای ایف یو کے مردہ جسم میں جان پڑ گئی ہے۔''

کیا ان جیسے بے حد مستعد اور جذباتی کارکنوں سے بہتر کوئی ٹیم بنائی جاسکتی ہے؟

خلیلی حکمتِ عملی کی سوچ بچار کے اور بھیم جی ان کے تصورات کو عملی جامہ پہنانے کے ذمے دار تھے۔ ان کا مشترکہ نظریہ تھا کہ اس کو اپنی کمپنی تصور کیجیے۔ اپنائیت کا تصور بہت طاقت ور ہوتا ہے۔ دونوں 'Seven Bricks' نامی مکان میں بیٹھ کر منصوبے بناتے اور گپ بازی بھی کرتے۔ ضیا کے مطابق روشن علی بھیم جی کا کام ابلاغ تھا۔ عوام سے رابطے کے معاملے میں وہ بہت اچھے تھے۔ لوگوں سے میل ملاقات، گفتگو، ہمت افزائی اور انتظام میں وہ اعلیٰ درجے کے ماہر تھے۔

والد صاحب سوچ بچار کے آدمی تھے۔ ان دونوں کی جوڑی بہت اچھی تھی اور ان ہی کہ وجہ سے ای ایف یو ایک حرکی ادارہ اور بیمے کی صنعت کا لیڈر بن گیا تھا۔''

صدی کے چھٹے عشرے میں ہونے والی ای ایف یو کی ترقی میں خلیلی کے کردار کو کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ کمپنی کی ۱۹۶۱ء کی بیلنس شیٹ کے مقدمے میں، جو ان کا پہلا تھا، انھوں نے لکھا تھا:

اس ادارے کی صدارت میں بڑے عظیم لوگ شامل رہے ہیں۔ ۲۹ برس قبل اس کی تاسیس میں آغا خان، سر سلطان محمد شاہ، بھوپال کے نواب سر حمید اللہ خان مرحوم اور وہ عظیم قوم پرست عبد الرحمٰن صدیقی جیسے لوگ شامل تھے۔ میں اس ادارے کو ایک وقف سمجھتا ہوں جو ان لوگوں نے قوم کو تحفے میں دیا تھا۔''

میں سمجھتا ہوں کہ عباس خلیلی ان ہی لوگوں میں سے ایک تھے۔ انھوں نے چیئر مین کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا اس لیے کہ وہ دوسرے منصوبوں پر عمل کرنا چاہتے تھے۔ مینجنگ ڈائریکٹر کے حیثیت سے ان کے دوست بھیم جی کی موجودگی کا مطلب یہ تھا کہ کمپنی محفوظ ہاتھوں میں ہے۔

جیسا کہ ہم نے دیکھا، خلیلی کو سرکاری ملازمت سے ۱۹۵۹ء میں فارغ کردیا گیا تھا مگر ان کو ذوالفقار علی بھٹو نے اسلام آباد طلب کیا اور وزارتِ دفاع کے ماتحت ڈیفنس پروڈکشن بورڈ کا چیئر مین بنا دیا۔ اس حیثیت میں انھوں نے ایران، ترکی اور لیبیا کے دورے کیے اور

اعی صنعت کی ترقی میں بے بہا کردار ادا کیا۔ وہ سابقہ مشرقی پاکستان سے ۱۹۷۱ء میں واپس ہوئے تھے اور بہت کچھ کھو کے آئے تھے۔ اور ب انھیں ملازمت پر دوبارہ بلایا گیا تو ان کا خیال تھا کہ وہ وزارتیں اسی طرح چلا سکتے ہیں جیسے کہ پہلے وزارتیں چلائیں تھیں۔ مگر ان کے ستوں کے مطابق یہ ایک خام خیالی تھی اس لیے کہ اس ماحول میں عباس خلیلی جیسا آزاد خیال انسان بھی زیادہ دن نہیں چل سکتا۔ عباس خلیلی سال تک چل سکے، جو کاؤس جی کے الفاظ میں، بھٹو کے معیار کے مطابق خاصہ طویل عرصہ تھا۔ ان کو بغیر کسی وجہ کے گھر بھیج دیا گیا۔ انھوں نے آخر وقت تک کام کیا، اپنے دفتر میں اس وقت تک کام کرتے رہے جب بہ جبران کو ہسپتال بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد وہ اپنے ادارے کے یئر مین تھے جو نجی شعبے میں ملک کی سب پرانی انجینئرنگ کی ایجنسی تھی۔ یہ ادارہ ملک سے باہر ملائیشیا، انڈونیشیا، امارات، سعودی عرب، شرقِ وسطیٰ کے کئی ممالک اور افریقا میں کام کر رہا تھا۔ انھوں نے کئی بین الاقوامی کانفرنسوں میں پاکستان کی نمائندگی کی، ایک بار بنگلور میں ECAFE کی صدارت بھی کی جس میں جواہر لال نہرو، اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل ڈاگ ہیمر شولڈ نے بھی شرکت کی تھی۔ خلیلی یونی ورسٹی ں تقریری مقابلوں میں اور کھیلوں میں حصہ لیتے تھے۔ وہ کھیل کے کئی اداروں سے منسلک تھے۔ وہ YMCA کے اور Old Scouts Associatio کے کئی برس تک رُکن رہے۔ وہ برسوں اسلامیہ کلب کے ممبر بھی رہے تھے جو ٹیبل ٹینس کا اہم مرکز تھا۔

میں اس وقت سے انھیں اچھی طرح جانتا تھا جب میں ای ایف یو کی انتظامیہ کا ایک رکن تھا اور عباس خلیلی اس کے چیئرمین تھے۔ و سب کے لیے وجدان کا منبع تھے اور مجھے بالخصوص اپنی بذلہ سنجی اور درّاک عقل کے باعث بہت اچھے لگتے تھے۔ وہ ایک اچھے انسان تھے، شخص کی پہنچ میں رہتے تھے، ایسے انسان جس کے اطراف پیشہ ورانہ مہارت اور اعتماد کا ایک ہالہ سا رہتا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے تھے اور عزت بھی کرتے تھے۔ اگرچہ عمر کے اعتبار سے ان کے مقابلے میں میرا کوئی خاص مقام نہیں تھا، مگر ان کی نظر میں عمر کسی قسم کی کاوٹ نہیں ہوتی، لہٰذا مجھے ایک قسم کی قربت اور انسیت ہوگئی تھی۔

میں نے آخری بار انھیں ای ایف یو کی گولڈن جوبلی تقریبات میں ۱۹۸۲ء میں دیکھا تھا۔ اس وقت بھی وہ ہمیشہ کی طرح تیز طرار ظر آتے تھے اور گزشتہ زمانے کی تمام جزئیات ان کو یاد تھیں۔ ان کی تعزیت میں ان کے دوست کاؤس جی نے لکھا تھا، ''وہ واقعتاً ایک غیر معمولی انسان تھے، بیدار مغز، دور بیں اور تجزیاتی ذہن کے مالک تھے۔ ۸۷ر برس کی عمر میں بھی وہ سارے ملک میں اُڑتے پھرتے اور اکرات میں تقریریں کرتے پھرتے تھے۔

ملک کے سیاست دانوں کو خطوط لکھ کر سیاسی اور عدالتی مسائل پر مشورے دیتے تھے۔

یہ لمبی عمر پانے کا راز ہے۔ انسان کو ضرور بالضرور اپنے زندگی میں اور اپنے اطراف میں ہونے والے واقعات میں دل چسپی لیتے ہنا چاہیے۔ ستاسی برس کی عمر میں وہ ساٹھ برس کے لوگوں سے بھی کم عمر لگتے تھے۔ میرے لیے یہ استثنیٰ اور مسرت کی بات تھی کہ میں انھیں انتا تھا اور ان کی، منکسرانہ ذہانت اور بذلہ سنجی سے فیضیاب ہوا تھا۔

وہ خوش قسمت تھے کہ انھیں طویل علالت لاحق نہیں ہوئی۔ ۱۳ر نومبر کو اسپتال میں داخل ہوئے اور ۱۷ر نومبر کو، جب ان کے اعزہ ن کے بستر کے اطراف موجود تھے پرسکون انداز میں موت سے ہم آغوش ہو گئے۔ ہم نے دوسرے دن ان کو ان کے پرانے رفیق 'ایڈمرل حسن کے قریب، نیوی کے قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا۔

مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ جب ۱۹۴۷ء میں وہ کراچی کے ہوائی اڈّے پر اترے تھے تو ان سے میری ملاقات ہوئی تھی اور جس صبح ن کا انتقال ہوا اس وقت بھی میں ان کے بستر کے قریب تھا۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے اور میں ہمیشہ ان کی کمی محسوس کروں گا۔''

عباس خلیلی نے ۱۷ر نومبر ۱۹۹۴ء کو انتقال کیا۔ ان کے پانچ بیٹے، دو بیٹیاں تھیں۔ اُن کی تیسرے نسل میں سترہ اولادیں تھیں جس ں نو لڑکے اور آٹھ لڑکیاں تھیں۔

مرزا احمد اصفہانی (بڑا صاحب)

۱۹۶۷ء میں ای ایف یو کے ڈھاکا کنونشن میں مرزا احمد اصفہانی گورنر منعم خان کو سووینئر پیش کر رہے ہیں

اصفہانی خاندان

زیبِ داستان

جب میں نے ۱۹۶۰ء میں ایسٹرن فیڈرل یونین میں ذمے داریاں سنبھالی تھیں تو مجھے اصفہانی حلقے کا حصہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ لوگ کمپنی کے سب سے بڑے حصے دار تھے اور مرزا احمد اصفہانی جن کو لوگ احتراماً 'بڑا صاحب' کہتے تھے، چیئرمین تھے اور عملی طور پر ان کے پاس کمپنی کا پورا کنٹرول تھا۔ اگرچہ ان کے نامزد جناب غلام حسین شیرازی قائم مقام چیئرمین تھے۔ یہ انتظام ضروری تھا کہ 'بڑا صاحب' نے وزیرِ اعظم پاکستان جناب لیاقت علی خان کی درخواست پر جوٹ بورڈ کا رُکن بننا قبول کر لیا تھا اور ساتھ ہی نئی تشکیل شدہ (PIDC) پاکستان انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کارپوریشن سے بھی منسلک ہو گئے تھے۔ یہ دونوں ادارے پاکستان کی معاشی اور صنعتی ترقی کے لیے بہت اہم تھے۔

اصفہانی خاندان نے پاکستان کے ابتدائی دنوں میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا، اسی طرح جیسا کہ وہ اس کی تخلیق سے پہلے ادا کر چکے تھے۔ دونوں بھائی، یعنی مرزا احمد اور مرزا ابوالحسن اصفہانی عملی طور پر آل انڈیا مسلم لیگ سے منسلک تھے اور ابوالحسن جناب محمد علی جناح کے نہایت معتمد ساتھی بن گئے تھے۔ مجھے علم نہیں کی ذمے داریوں کی تقسیم کسی دور رس منصوبے یا کسی سوچی سمجھی حکمتِ عملی کی بنا پر تھی یا بس یوں ہی ہو گئی تھی۔ بہر حال اس کے باعث اصفہانی خاندان نے اپنے کاروباری مقاصد میں بہت کامیابی حاصل کی۔ مرزا ابوالحسن کو سیاسی میدان میں آگے کر کے اور مرزا احمد کو 'بڑا صاحب' کے رُتبے پر اور محمد علی جناح کے سب سے اہم معاشیاتی مشیر کے درجے پر فائز کر کے اصفہانی گروپ ایسی پوزیشن میں آ گیا تھا جہاں وہ اپنی ترقی کی خاطر خواہ منصوبہ بندی کر سکتا تھا۔

اس زمانے کے قاری کے لیے اصفہانی خاندان کے بارے میں کچھ لکھنا کارِ دُشوار ہے۔ جب ۱۹۷۰ء میں پاکستان تقسیم ہو گیا اور بنگلہ دیش وجود میں آ گیا تو اصفہانی گروپ بھی خاندانی جھگڑوں اور سیاسی مسائل کی وجہ بھی دو حصوں میں بٹ گیا۔ ان دونوں بھائیوں کے درمیان کیا ہوا اور کیسے ہوا، میں اس کے بارے میں کچھ لکھنے کا مجاز نہیں، اگرچہ یہ دونوں اس سے قبل ایک دوسرے کے لیے بہت قریبی اور قابلِ اعتماد دوست بھی تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ابوالحسن، اپنی سیاسی اور سرکاری افسری کی زندگی میں بہت سے قابلِ احترام رُتبوں پر فائز رہ چکے تھے اس لیے انھوں نے سرکاری نوکری کو چھوڑ کر پاکستان ہی میں رہنے کا فیصلہ کر لیا جب کہ 'بڑا صاحب' اپنی بنگالی بنیاد سے جڑے رہے اور انھوں نے جہاں تک اور جس قدر ممکن ہوا، اپنی موروثی خاندانی 'سلطنت' کو بچانے کی کوشش کی۔

اصفہانی خاندان سے میری دل چسپی ای ایف یو سے ان کے مالیاتی رشتوں تک محدود ہے۔ اگرچہ ۱۹۸۹ء تک اس خاندان کے لوگ کمپنی کے بورڈ پر بھی تھے، جن میں آخری مرزا محمد اصفہانی کے والد ابوالحسن مرحوم تھے جن کو Isky کی عرفیت سے پکارا جاتا تھا۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے فوراً بعد تک کمپنی کے بورڈ پر تین اصفہانی موجود تھے۔ اصفہانیوں کے فیصلہ کن اثرات ۱۹۶۱ء میں اس وقت ختم ہوئے جب 'بڑا صاحب' نے اپنے اکثریتی حصص فروخت کرنے اور بھیم جی کو کمپنی کی زمامِ انتظام سونپنے کا فیصلہ کیا، جو ایک معاہدے کے تحت ادارے کے چیف ایگزیکٹیو بن گئے تھے۔

اس کتاب کے متن کی تیاری کے سلسلے میں مجھے خاندان کے دونوں بازوؤں سے گفتگو کا موقع ملا تھا، کراچی میں مرحوم ابوالحسن اصفہانی کی بیگم قمر اصفہانی اور ڈھاکے میں مرزا احمد یعنی 'بڑا صاحب' کے بیٹے صدری سے۔ دونوں مجھ سے بہت ہم دردی سے پیش آئے اور 'پرانی ایسٹرن فیڈرل' کے بارے میں اس طرح بولے گویا وہ اپنے کسی بہت ہی پیارے دوست کے بارے میں بات کر رہے ہوں جس سے مجبوراً رابطے منقطع کرنے پڑے ہوں۔ مگر ان میں کسی قسم کی بدمزگی محسوس نہیں ہوئی، بلکہ ماضی کی باتوں پر افسوس کے سائے ضرور محسوس ہوئے۔ ماضی کی وہ یادیں جو حال میں کسی کے لیے بھی اہم نہیں رہ گئی تھیں۔

مرزا احمد ۱۸۹۸ء میں برما کے شہر رنگون میں پیدا ہوئے تھے۔ جیسا کہ بتایا جاتا ہے، ان کی والدہ وہاں کے چاولوں کے ایک بہت بڑے تاجر کی بیٹی تھیں۔ ان کی شادی اور پہلے بیٹے کی پیدائش کے بعد وہ مدراس میں بس گئے تھے۔ پھر وہ کلکتے چلے گئے جہاں ان کے خاندان کا اچھا خاصا کاروبار تھا۔ یہ کاروبار احمد کے دادا نے جمایا تھا جو ایرانی النسل تھے اور اصفہان سے تعلق رکھتے تھے۔ احمد نوجوان تھے جب وہ قاہرہ چلے گئے تھے جہاں وہ بارہ برس رہے اور اس دوران ایک کامیاب تاجر بن گئے۔ وہ جدید خیالات اور دور بیں نگاہوں کے آدمی رہے ہوں گے اس لیے کہ انھیں جلد ہی مؤثر ابلاغ کی اہمیت کا احساس ہوگیا تھا اور وہ روبہ روذاتی مراسم کے قائل تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے منطقے میں اور برصغیر ہندوستان میں بہت سے لوگوں سے ذاتی تعلقات استوار کر لیے تھے جس کی وجہ سے وہ بنگال کے تجارتی مرکز کلکتے میں اپنا ایک خاصا بڑا دفتر بنانے میں کامیاب ہوگئے تھے۔

مرزا احمد کے بیٹے صدری اصفہانی نے بتایا کہ ''جس برس ہم اور ہمارے خاندان والے دنیا کے اس حصے میں آئے تھے وہ ۱۸۲۰ء تھا۔ ایران سے وہ سب پہلے مغربی ساحل پر آئے اور اس کے بعد مدراس پہنچے۔ جب تک پہلی عالمی جنگ شروع نہیں ہوئی تھی خاندان والوں کا برابر آنا جانا رہتا تھا۔ غیر ملکیوں کی طرح، ایران واپس جانا، وہیں اپنی بیویوں سے ملنا، وہیں بچے پیدا کرنا، یا شادیوں کے رشتے لگانا۔ لگاتار آمد و رفت، اور حقیقت میں بے گھر۔ پھر ہمارے کچھ لوگوں نے ہندوستان میں مستقل قیام اور زندگی گزارنے کا ارادہ کیا۔ سو، جب ہمارے قبیلے کے کچھ لوگ مدراس میں بس رہے تو، خلیلی خاندان کی طرح، آہستہ آہستہ مقامی لوگوں میں شادیاں کرنی شروع کر دیں۔ انھوں نے بنگالیوں، پنجابیوں اور دوسرے ہندوستانیوں سے میل ملاپ شروع کر دیا۔''

۱۹۱۱ء کے لگ بھگ مرزا احمد کی والدہ اچانک انتقال کر گئیں، اور ان کے والد نے دو بھائیوں ابوالحسن اور محمد علی کے ساتھ ان کو مدراس بھیج دیا جہاں ان کے قبیلے کے کچھ لوگوں نے ان کو پالا پوسا اور وہ وہیں بڑے ہوئے۔ کاروبار، جو چائے اور نیل پر مشتمل تھا، خاصا بڑھ چکا تھا اور مرزا احمد، جو بڑے بیٹے تھے، ۱۹۱۸ء میں کاروبار سنبھالنے کی غرض سے کلکتے چلے گئے۔ اتفاق سے یہ مناسب وقت تھا، اس لیے کہ اس کے فوراً بعد ہی خاندان کے افراد کے درمیان کچھ مسائل پیدا ہوگئے۔ ان کے والد کے بھائی نے، جو پہلی عالمی جنگ کے دوران لندن میں مقیم تھے، عدالتی چارہ جوئی پر مجبور کر دیا اور خاندان والوں کو مشترکہ اثاثوں کا بٹوارہ کرنا پڑا۔ اس وجہ سے مدراس میں ان کا قیام ضروری ہوگیا تھا اور نوجوان مرزا احمد تنِ تنہا کاروبار چلانے کے لیے رہ گئے۔ دونوں بھائیوں کے درمیان قانونی جنگ کئی برس تک چلتی رہی اور مرزا احمد کو کامیابی سے کاروبار چلانے کے لیے سرمایہ مہیا کرنا مشکل ہوگیا۔ انھوں نے اپنے والد سے تنازعے کے جلد سے جلد تصفیے کی درخواست کی۔ انھوں نے اپنے والد سے کہا، ''جتنا جلد ہو سکے ان سے معاملہ طے کیجیے۔ وہ جو کچھ مانگتے ہیں دے دیجیے، جو جائیداد مانگتے ہیں، دے دلا کر رفع دفع کیجیے تاکہ ہم اپنا ذاتی کاروبار شروع کر سکیں۔''

والد نے غور سے ان کی بات سنی، تصفیے کا فیصلہ کیا، مگر چند ماہ کے اندر ہی ان کا انتقال ہوگیا۔ اس وقت ان کی عمر پچاس برس سے زیادہ کی نہیں رہی ہوگی۔ یہ ۱۹۲۵ء کا زمانہ تھا اور مرزا احمد اب خاندان کے مربّی تھے اور 'بڑا صاحب' نے اپنے جوہر دکھائے۔ ۱۹۸۸ء میں جب ڈھاکے میں ہماری ملاقات ہوئی تو ان کے سب سے بڑے بیٹے صدری نے بتایا، ''مگر کچھ خوش قسمتی کے علاوہ، ہماری کامیابی ان

رشتوں کی مرہونِ منّت تھی جو ہم اپنے سمندر پار ایجنٹوں سے استوار کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اور میرے والد کی یہی سب سے بڑی طاقت تھی۔ وہ اپنے کچھ بہت قریبی دوستوں کے ذریعے اچھے رابطے استوار کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے جس کے گُر انھوں نے اپنے والد سے سیکھے تھے۔ اس طرح اصفہانی خاندان، دوستانہ مسابقت رکھنے والے خاندان آدمجی، کی طرح ایک مضبوط معاشیاتی طاقت بن گیا۔'' بیگم اصفہانی نے، جنھوں نے از راہِ کرم مجھے اپنے کراچی کی قیام گاہ پر ملنے کا وقت دیا تھا، بتایا کہ '' وہ بڑے غیر معمولی کاروباری آدمی تھے۔ اصفہانی خاندان میں جو کچھ بھی ہوتا تھا مرزا احمد کی ایما پر ہوتا تھا۔ وہ بہت اعلیٰ درجے کا ذہن رکھتے تھے۔''

خاندانی کاروبار میں تینوں بھائی عملی طور پر حصہ لیتے تھے۔ مرزا احمد ان کے متفقہ ہم پلّہ مگر بزرگ تھے۔ صدی کے تیسرے عشرے کی ابتدا ہی سے ابوالحسن سیاست میں الجھتے چلے گئے۔ ۱۹۲۰ء میں پہلی ملاقات سے ہی وہ محمد علی جناح کے گرویدہ ہو گئے تھے۔ ان دنوں وہ کیمبرج میں اپنی تعلیم کے پہلے برس میں تھے۔ جناح صاحب نے انڈین مجلس کے ارکان سے خطاب کرنے کی دعوت قبول کر لی تھی۔ یہ حلقہ انگلستان میں ہندوستانیوں کی پہلی مباحثہ سوسائٹی تھی۔ ابوالحسن کہتے ہیں کے خطاب کے دوران قائدِ اعظم، اپنے مشہور رکھ کھاؤ کے باوجود نوجوانوں سے بہت قریب دکھائی دیے۔ ہم ان کے اندازِ تخاطب، زبان کی سلاست، اور سیاسی باریکیوں پر مکمل عبور سے مبہوت ہو کر رہ گئے تھے۔ انھوں نے ہمیں اپنی تعلیم پر توجہ مرکوز رکھنے اور تعلیم یافتہ ہو کر مادرِ وطن واپس جانے کا مشورہ دیا تا کہ ہم برطانیہ کے تسلط سے آزادی حاصل کر سکیں۔''

سال پر سال گزرتے گئے اور جب جناح صاحب لندن میں اپنی خود ساختہ جلاوطنی ختم کر کے واپس آئے تو انھوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ آل انڈیا مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ کی تشکیل کی جس کے وہ صدر بنے اور جو سات ارکان نامزد کیے گئے ان میں دو اصفہانی برادران مرزا احمد اور ابوالحسن شامل تھے۔ اور اس کتاب کے تناظر میں جو ایک اور اہم نام تھا وہ عبدالرحمٰن صدیقی کا تھا جو ایسٹرن فیڈرل یونین کے بنیاد گزاروں میں سے تھے۔ جناح صاحب نے مسلم لیگ کو اس کے خوابِ غفلت سے بیدار کرنے، اس کو نئے ساحلوں اور خوش نما مستقبل کی طرف لے جانے کی ذمے داری سنبھال لی تھی۔ بظاہر، وہ اپنے نئے اور نوجوان پیروکاروں، ابوالحسن اور عبدالرحمٰن صدیقی سے بہت متاثر تھے اس لیے ان دونوں کو انھوں نے بنگال میں مسلم لیگ کی تنظیم کی ذمے داری سونپ دی۔ انھوں نے ابوالحسن کو، جو عمر میں چھوٹے تھے، مرکزی کردار ادا کرنے اور دوڑ بھاگ کرنے کے لیے کہا۔ دوسرے الفاظ میں کامیابی حاصل کرنے کی ذمے داری ابوالحسن کے کاندھوں پر تھی۔

مرزا احمد نے جہاں تک ممکن ہوا سیاسی میدان میں اپنے چھوٹے بھائی کی حمایت کی۔ وہ اس بات کے بھی قائل ہو گئے تھے کہ ابوالحسن کا مستقبل کاروبار سے زیادہ جناح صاحب اور مسلم لیگ کے ساتھ ہوگا۔ انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی محمود کو اپنے کاروبار کا مزید بوجھ اُٹھانے پر راضی کر لیا۔

قائدِ اعظم 'بڑا صاحب' کے مشوروں اور حمایت کی بہت قدر کرتے تھے اور وہ اکثر ان سے معاشیاتی اور مالیاتی مسائل پر تبادلۂ خیال بھی کرتے تھے۔ ان دنوں ایک بہت ہی قریبی حلقہ تھا جو قائدِ اعظم کے اطراف ہوتا تھا۔ اس وقت تک مسلم لیگ عوامی تحریک کی صورت نہیں اختیار کر سکی تھی جو بہت بعد میں ممکن ہوا تھا۔ ابوالحسن نے کلکتے میں ہونے والے ایک بڑے سیاسی بحران کے ضمن میں بتایا جو اے کے فضل الحق کی ذاتی جاہ طلبی کے باعث پیدا ہوا تھا۔ ابوالحسن اور ان کے سیاسی دوستوں نے جناح صاحب سے فوراً کلکتے پہنچ کر بنگال کے مسلمانوں کو آل انڈیا مسلم لیگ کے پرچم تلے متحد کرنے کی درخواست کی تھی، '' تا کہ وہ اپنے حقوق کے حصول کے لیے ہندوؤں کا اعتماد کے ساتھ مقابلہ کر سکیں'' جناح صاحب نے فوراً ان کی درخواست کو قبول کیا اور ایک طویل سفر کے بعد بمبئی سے کلکتے پہنچ گئے۔ ابوالحسن کے مطابق '' جو لوگ جناح صاحب کے استقبال کے لیے ہوڑہ اسٹیشن پر پہنچے ان میں میرے بڑے بھائی مرزا احمد اصفہانی، خواجہ نورالدین اور میں شامل تھا۔ یہ

وقع بعد کے مواقع سے کتنا مختلف تھا جب اسی ہوڑہ اسٹیشن پر شہر اور پُل کی جانب سے لوگ ریل گاڑی کی آمد سے گھنٹوں پہلے امڈ آیا کرتے تھے۔ ہم لوگ جناح صاحب کو 5 Camac Street پر واقع اپنے گھر لے آئے۔ شام تک ہم ان کو موجودہ حالات اور صوبے میں سیاسی صورتِ حال کی تفصیلات بتاتے رہے اور وہ وجوہات بھی جن کے زیرِ اثر بنگال میں مسلم لیگ کی چولیں ہل گئی تھیں۔ اپنے نوجوانوں کے مقابلے میں ہم لوگوں کو اپنی تاریخ کا بہتر ادراک تھا۔ لہٰذا یہ طے ہوا کہ میں جناح صاحب کے ADC اور پرائیویٹ سیکریٹری کی خدمات انجام دوں اور ان سے ملاقاتوں کے انتظامات کروں۔''

دونوں بھائی ایک ہم آہنگ ٹیم کی طرح تھے۔ ابوالحسن جناح صاحب سے قریب سے قریب تر ہوتے گئے جب کہ مرزا احمد عقب سے خفیہ ڈوریاں ہلاتے۔ ان کے بڑے بیٹے صدری نے بتایا کہ ''میرے والد آنے والے انتخابات کے لیے کامیابی سے چندے جمع کرتے، س لیے کہ وہ ان لوگوں کے نام اور پتے سے واقف جن پر بھروسا کیا جاسکتا تھا۔ قدرتی طور پر جناح صاحب اور میرے چچا حسن ایسے معاملات میں نہیں الجھ سکتے تھے اس لیے کہ بنگال میں ان کے والد جیسے رسوخ اور تعلقات ان لوگوں کو میسر نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جناح صاحب بنگال کے معاملات میں میرے والد کی رائے علیحدہ سنتے تھے۔ بنگال میں قیام اور کاروبار کرنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ عوام کے کسی طبقے کے سخت رویے یا ان سے علیحدگی کی وکالت نہیں کرتے تھے۔ بڑے افسوس کی بات یہ ہے کہ ہندوستان کے اس علاقے میں کچھ اسی طرح کے فیصلے کیے جاتے تھے۔ اور صحیح معنوں میں میرے والد خالص سیاسی آدمی تھے اور ایسے حالات میں میرے چچا کے مقابلے میں وہ فضل الحق اور سہروردی صاحبان کے ساتھ زیادہ لچک دار رویہ اختیار کرتے۔ ظاہر ہے کہ ان کے تجارتی مفادات ان کے رویے پر اثر انداز ہوتے تھے مگر ان کے ساتھ ساتھ وہ اس بات کے قائل تھے کہ آج کے فضل الحق کے مقابلے میں دو برس بعد کے فضل الحق بالکل مختلف ہوں گے اس لیے اس وقت کا لچک دار رویہ عوام کے حق میں کہیں بہتر ہوگا۔ بہر حال ان کو مسلم لیگ کے لیے چندے بھی وصول کرنے تھے اور اس ضمن میں وہ مسلم لیگ سے احترام کے حق دار تھے۔ اس سلسلے میں ایک عملی مثال لے لیجیے: جب بھی کوئی مسلم لیگ کی طرف سے آدمجی خاندان کے افراد کے پاس جاتا تو سب سے پہلا سوال ہوتا کہ ''ہمیں بتایئے کی اصفہانی نے کتنا دیا؟'' اور ہمیشہ ان کا یہی پیمانہ ہوتا جس کے مطابق وہ مالی امداد فراہم کرتے تھے۔ ان تمام مصروفیات کی وجہ سے ابوالحسن کاروبار سے کم سروکار رکھتے اور ان کے چھوٹے بھائی زیادہ فعال ہوتے گئے۔ آپ جانتے ہیں کہ خاندانی کاروبار میں مل جُل کر یہ فیصلے کیے جاتے ہیں کہ مال کب خریدا جائے اور کب فروخت کیا جائے اور ظاہر ہے کہ کسی کو عمل بھی کرنا ہوتا ہے جب کہ میرے چچا یہ سب نہیں کر سکتے تھے۔ مگر وہ مسلم لیگ کی اہم کمیٹی رُکن ہونے کے باوجود ہمیشہ مشاورت کی خاندانی بیٹھکوں میں شریک ہوتے جو کم از کم مہینے میں دو بار ہوتی تھیں۔ میں اس مقام پر خصوصاً ۱۹۳۸ء اور ۱۹۳۹ء کے بارے میں بات کر رہا ہوں۔ بسا اوقات وہ شہر میں نہیں ہوتے تھے، مگر جب اہم کاروباری فیصلے کرنے ہوتے تو وہ ضرور موجود ہوتے تھے۔''

ایک ساتھ مل کر دونوں بہت طاقت ور اور بارسوخ ہوتے۔ راجا صاحب محمود آباد نے، جو خود بھی مسلم لیگ کے ایک اہم رُکن اور ابوالحسن کے قریبی دوست بن گئے تھے، اپنے ایک دوست کی کتاب کے مقدمے میں ابوالحسن کے بارے میں لکھا ہے، ''اب تیس برس ہونے کو آئے ہیں کہ میں اور ابوالحسن اصفہانی دونوں جگری دوست ہیں۔ ہماری پہلی ملاقات اپنے ایک مشترکہ دوست خواجہ نورالدین کے توسط سے ۱۹۳۱ء میں کلکتے میں ہوئی تھی۔ دو سال بعد ہم دونوں کو قائدِ اعظم نے لاہور میں ایک میٹنگ میں مدعو کیا تھا جس میں مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ کا قیام عمل میں آیا تھا۔ یہی وہ موقع تھا جب ہم دونوں نے قسم کھائی تھی کہ قائدِ اعظم کی سربراہی میں ہم اپنی زندگیاں مسلم قوم کی خدمت کے لیے وقف کر دیں گے۔ اس یادگار دن کے بعد سے قائدِ اعظم کے انتقال کے وقت تک، جو بھی معمولی اختلافات رہے ہوں ان کے باوجود بھی ہمارے قدم اپنے رہنما اور اپنے مقصد سے وفاداری کی راہ میں کبھی متزلزل نہیں ہوئے۔ ہم نے ان کو اپنا پیار بھی دیا، عزت بھی اور وفاداری بھی، جن کے بدلے میں انھوں نے پورے اعتماد کے ساتھ ہم پر اعتبار کیا۔

میں بلاخوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ مسلمانوں کے سب سے بڑے صوبے بنگال میں قائد نے جو بھی فیصلے کیے، انھوں نے مرزا احمد اصفہانی کی اطلاعات پر مکمل اعتماد کیا۔ ۱۹۴۶ء میں جناب اصفہانی ان کے ذاتی نمائندے اور مسلم لیگ کے سفیر مقرر ہوئے تا کہ وہ غیر ملکی رہنماؤں کو برصغیر کے مسلمانوں کی آزادی کے بارے میں حقائق سے آگاہ کرتے رہیں۔ قائدِ اعظم کی زندگی میں اصفہانی صاحب ان کے وفادار اور قابلِ اعتماد نائب رہے۔''

اسی لیے جب ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان وجود میں آگیا تو قائد نے ان کو ریاست ہائے متحدہ امریکا میں پاکستان کا پہلا سفیر متعین کیا۔ اس دنوں نو تشکیل شدہ ملک میں ہر چیز کی کمی تھی حتیٰ کہ پاکستان کے لیے سفارت خانے کی عمارت کی تعمیر میں بھی اصفہانی خاندان نے اپنا سرمایہ لگا دیا تھا۔ جب پاکستان مالی طور پر بہتر حالت میں آگیا تو یہ رقم ان کو واپس ادا کر دی گئی۔

ساتھ ہی ساتھ ان کے بھائی مرزا احمد نے نہ صرف اپنے ہمہ جہت خاندانی کاروبار کی نگہداشت کی جس میں پٹ سن، چائے، پارچہ جات، انجینئرنگ، جہاز رانی، دیا سلائی اور پلائی ووڈ شامل تھے بلکہ جب بھی طلب کیا گیا انھوں نے ملکی خدمات کے لیے بھی وقت نکالا۔ حکومت کے بنائے ہوئے جوٹ بورڈ میں بھی، جو وزارتِ تجارت کے ماتحت تھا اور جس کی صدارت غلام فاروق کے سپرد تھی، مرزا احمد کی رُکنیت ایک بہت اہم ذمے داری تھی جو انھوں نے سنبھالی تھی۔ اسی طرح وہ PIDC میں بھی شامل تھے اور ان ذمے داریوں ہی کی وجہ سے انھیں ایسٹرن فیڈرل یونین کے چیئرمین کے عہدے کو عارضی طور پر چھوڑنا پڑا تھا۔

پاکستان کی تشکیل سے پہلے کے سخت مصروف اور فیصلہ کن دنوں میں بھی مرزا احمد اور ابوالحسن دو ایسے بڑے اداروں کی بنیاد رکھنے میں مصروف رہے تھے جن کو آگے چل کر نئی مملکت کی معاشیات میں اہم کردار ادا کرتا تھا۔ یہاں میری مراد اور ینٹ ایئرویز اور مسلم کمرشل بینک سے ہے۔ ابوالحسن نے کچھ تفصیلات بیان کی ہیں:

''یہ جون ۱۹۴۶ء کا واقعہ ہے، میں دلّی میں تھا، اور حسبِ معمول قائدِ اعظم سے ملاقات کے لیے ان کی قیام گاہ ۱۰ اورنگزیب روڈ پر گیا تھا، ہم دوپہر کا کھانا کھانے میں مصروف تھے، اس دوران ہمارے درمیان صوبائی اور قومی سیاست پر بھی باتیں ہو رہی تھیں۔ قائد نے بات کاٹتے ہوئے فرمایا، 'باتیں کرنے کے لیے یہ سب تو ٹھیک ہے کہ مسلمان ایک قوم ہیں اور ان کے اپنے علیحدہ وطن کا مطالبہ بھی ٹھیک ہے جس میں وہ اپنی مرضی سے رہ سکیں اور اپنے مستقبل کے خود مالک ہوں، مگر تمھیں اس بات کا اندازہ بھی ہے کہ یہ مملکت کسی کام کی نہ ہوگی، اگر ہمارے پاس اس کو چلانے کے لیے مناسب افراد اور ضروری وسائل نہ ہوں۔ کیا تمھیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ ہندوستان میں ایک بھی ہوائی کمپنی نہیں جو مسلمانوں کی ملکیت ہو؟ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہوائی کمپنیاں ملکیت، سرمائے اور انتظامی افراد کے لحاظ سے ہندوؤں کی ہیں؟ کیا تمھیں معلوم ہے کہ ہمارے ملک میں کتنے مسلمان ہوا باز اور انجینئر ہیں؟ بھلا وسائل کی ایسی کمی کی صورت میں، جو کسی بھی قوم کے پاس وافر مقدار میں ہونی چاہیے، ہم کیا کر سکیں گے؟''

ابوالحسن نے اپنے بھائی اور سر آدمجی سے کلکتے میں اس مسئلے پر تبادلۂ خیالات کیا اور بغیر کسی تاخیر کے، فوراً ہی وہ ایک ہوائی کمپنی کی داغ بیل ڈالنے میں مصروف ہو گئے۔ اور پھر انھوں نے اور ینٹ ایئرویز کے نام سے کمپنی بنائی جو تقسیم ہند سے پہلے مسلمانوں کی پہلی ہوائی کمپنی تھی۔ اس کی پروازوں کی شروعات میں کچھ وقت لگا اس لیے کہ متعلقہ سرکاری اداروں میں ہندو اکثریت ایک کے بعد دوسرے تاخیری بہانے کرتی رہی تا آں کہ ساری رکاوٹیں دور کر دی گئیں۔

ابوالحسن لکھتے ہیں کہ ''اور ینٹ ایئرویز کا اڈّہ کلکتے میں تھا۔ اس کمپنی کی جانشین آج کی PIA کے مقابلے میں اور حکومتی امداد اور سرمائے کے بغیر یہ ایک معمولی سا ادارہ تھا۔ تقسیم ہند کے بعد اور ینٹ ایئرویز نے اپنا اڈّہ کراچی منتقل کر دیا اور ایک دن کی بھی تاخیر کے بغیر پروازیں شروع کر دیں اور اس وقت تک جاری رکھیں جب تک کہ اس کو نئے ادارے PIA میں ضم نہیں کر دیا گیا۔ اور ینٹ ایئرویز نے تقسیم

کے بعد کے فسادات کے دنوں میں عوام کی خدمت کے فرائض انجام دیے۔ اس نے مسلمانوں کو پاکستان لانے اور ہندوؤں کو ہندوستان لے جانے میں مدد فراہم کی۔ اگر اورینٹ نہ ہوتی تو تقسیم کے بعد مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان طویل عرصے تک کوئی ہوائی رابطہ ہی نہ ہوتا۔'' ہوائی کمپنی کے بارے میں جناح صاحب کے مشورے کے پیچھے کارفرما اصل طاقت مرزا احمد اصفہانی ہی کی تھی جس میں آدمجی کی امداد بھی شامل تھی۔

مسلم کمرشل بینک کی ابتدا بھی کچھ اسی نوعیت کی تھی جس میں یہی 'کھلاڑی' حصہ لے رہے تھے۔ ابوالحسن نے کہا، ''ہم میں سے کتنے لوگوں کو علم ہے کہ وہ قائدِاعظم ہی تھے جن کے اصرار پر برّصغیر میں مسلمانوں کے ایک اور بینک کی داغ بیل ڈالی گئی۔ قائد کہتے تھے کہ 'ہم ایک سوملین افراد کی قوم ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور ہمارے پاس ہندوستان کے بے شمار بینکوں میں صرف ایک ہی بینک (حبیب بینک) ہے' اور یہ بالکل سچ بات تھی۔ یہ دراصل مرحوم سر آدمجی حاجی داؤد اور میرے بھائی، مرزا احمد، سے ان کے بار بار اصرار اور بحث کا نتیجہ تھا کہ مسلم کمرشل بینک وجود میں آیا۔ اس کی تشکیل تین کروڑ کے منظور شدہ سرمائے سے ۹ر جولائی ۱۹۴۷ء کو کلکتے میں ہوئی۔ تقسیم کے بعد، جو تھوڑے ہی عرصے بعد ہوگئی تھی، ۱۹۴۸ء تک پاکستان کے بڑے شہروں میں اس کی شاخیں کھل گئیں اور اس کا صدر دفتر کراچی میں قائم کیا گیا۔''

اورینٹ ایئرویز کے حالات کے برعکس بینک پر آدمجی خاندان کو پوری گرفت حاصل تھی۔ صدری کہتے ہیں کہ ''یوں ہوا کہ دوسرے دو گروہوں نے، جن کی ملکیت میں بینک کا خاصا بڑا حصہ تھا، اپنے حصص آدمجی خاندان کے ہاتھ فروخت کر دیے۔ اس طرح وہ بینک کے سب سے زیادہ حصص کے مالک ہوگئے۔ میرے والد، کو اس بات کا آخری عمر تک قلق رہا۔''

مجھے یہ خاصا دل چسپ، اور مخصوص ہندوستانی اندازِ خیال معلوم ہوا جو مسلمان معاشرے کے بڑے کاروباری افراد میں عام تھا۔ اس لیے میں نے صدری اصفہانی سے پوچھا کہ کیا اس واقعے کی وجہ سے ان کے والد اور سر آدمجی کے درمیان تعلقات میں تلخی نہیں ہوئی؟ وہ مسکرائے اور کہا، ''وہ آپس میں اچھے دوست تھے مگر ساتھ ہی ایک دوسرے کے کاروباری حریف بھی تھے۔ مگر یہ وہ دن تھے جب ہمارے پٹ سن کے کارخانے نہیں تھے۔ مگر درآمد اور برآمد کے میدان میں کسی چیز میں وہ آگے تو کسی میں ہم آگے تھے۔ اس طرح ہم ایک دوسرے کے براہِ راست مدِّ مقابل نہیں تھے۔ اور پھر ہمارے اور ان کے اندازِ کار مختلف تھے، اور ایسا لگتا تھا کہ دونوں گروہ عمداً ایک دوسرے کے راستے میں آنے سے پرہیز کرتے تھے جس سے دوسرے گروہ کے مفادات پر ضرب پڑے۔''

میں نے اب تک برّصغیر کی تقسیم اور اس کے بعد کے جن حالات کی تفصیلات لکھی ہیں ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں اصفہانی بھائی پاکستان کی ترقیاتی کوششوں میں اتنے مصروف رہتے تھے کہ ان کے پاس ایسٹرن فیڈرل یونین کے مسائل کے لیے وقت نہیں ہوتا تھا اس لیے یہ ادارہ ان کی فہرستِ ترجیحات میں اوپری درجے پر نہیں معلوم ہوتا تھا۔ میرے خیال میں یہ کہنا مرزا احمد سے ناانصافی ہوگی اس لیے کہ ایسٹرن فیڈرل یونین کے مفادات ہمیشہ ان کے دل میں پیوستہ رہے تھے۔ ان کے کاروباری ڈھانچے کی جزئیات کے مطابق یہ بیمہ کمپنی ان کی اپنی اختراع نہیں تھی نہ وہ اس کی بنیاد گزاری میں شریک تھے۔

یہ تو مسلم لیگ میں ان کی عملی سرگرمی یا فعالیت تھی جس کی وجہ سے ان کا سابقہ ایسی شخصیات سے پڑتا رہا جو ۱۹۳۲ء میں ای ایف یو کی تشکیل میں شریک تھے۔ جن میں عبدالرحمٰن صدیقی، نواب صاحب بھوپال، راجا صاحب محمود آباد، غلام محمد، اور کے ایف حیدر جیسے اہم حضرات شامل تھے۔ میں ایسے کاغذاتِ شہادت حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا جن سے یہ معلوم ہوسکے کہ کیوں اور کس طرح اصفہانی خاندان مسلمانوں کی تشکیل دی ہوئی اس کمپنی سے منسلک ہوا، سوائے اس کے کہ کمپنی کے ۱۹۳۵ء کے میزانیے میں، جو اس ادارے کا تیسرا میزانیہ تھا، کلکتے کے ایک تاجر مرزا احمد اصفہانی کا نام کمپنی کے بورڈ کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے شامل کیا گیا تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اصفہانی

خاندان اپنے تمام کاروبار کا بیمہ اسی ادارے سے کرانے کے ذریعے اس کی خاصی کاروباری امداد کرتا تھا۔ اگر چہ اصفہانی خاندان کمپنی کے چیف ایجنٹ ہونے کے باعث کاروبار پر کمیشن لینے کا حق دار تھا مگر صدری اصفہانی کے مطابق ، ہم نے اس کمپنی کے ابتدائی دور میں، اپنے تمام کاروبار پر کمیشن لینے سے پرہیز کیا تھا۔

۱۹۴۹ء میں بھی، جب یہ فیصلہ ہونا تھا کہ ای ایف یو کا صدر دفتر کلکتے سے پاکستان منتقل کیا جائے یا ہندوستان میں ہی رہنے دیا جائے، اصفہانی بردران نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس ضمن میں اس وقت کے ڈپٹی جنرل منیجر ای سی آئیون نے ،جنھیں اصفہانی برادران ہی جرمنی کی سب سے بڑی بیمہ کمپنی الیانز سے لے کر آئے تھے، فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا۔

ای ایف یو کے اس مشکل وقت کے سلسلے سے، جب لندن میں ہونے والے نقصانات ہوئے تھے، مرزا احمد اصفہانی کے رویے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے کہ جب کمپنی مالی مشکلات میں گرفتار ہونے کے باعث نہ صرف سسک رہی تھی بلکہ سخت مالی اصولوں کے مطابق دیوالیہ ہونے کے قریب پہنچ چکی تھی، اصفہانی خاندان کو اپنا سرمایہ لگا کر امداد کرنی چاہیے تھی۔

میرے پاس وہ ساری خط کتابت موجود ہے جو میرے ساتھی اِروِن سی ایون نے لندن میں ہونے والے نقصانات کے حوالے سے ای ایف یو کے اس وقت کے جنرل منیجر جناب کے ایف حیدر سے کی تھی۔ Marine Hull Underwriting میں ہونے والے نقصانات کی تفتیش کے لیے آئیون کو لندن بھیجا گیا تھا۔ ان خطوط سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا احمد اصفہانی نے حقیقتاً اس معاملے میں خاصی دل چسپی لی تھی۔ وہ اور ان کے جرمن دوست آئیون کی دریافت پر تبادلۂ خیالات کرنے کے لیے ملے تھے۔ مگر کسی مرحلے پر اضافی سرمایہ لگانے کا سوال نہیں اُٹھایا گیا تھا۔ کیا اس کی یہ وجہ تھی کہ حیدر صاحب سوئے ہوئے شیر کو جگانا نہیں چاہتے تھے، اس لیے کہ انھیں امید تھی کہ شاید کمپنی اس مسئلے میں الجھنے سے بچ جائے گی؟ یا پھر اس لیے کہ لندن کے قرض خواہ اپنے مطالبات میں کمی پر آمادہ ہو جائیں گے۔ یا، حیدر صاحب جانتے تھے کہ اصفہانی خاندان ان دنوں اپنی کاروباری ضروریات کی بنا پر مالی طور پر اس حالت میں نہیں تھا کے مزید سرمایہ فراہم کرتا۔ میرے خیال میں یہ سوالات ہمیشہ تشنۂ جواب رہیں گے۔

میرے ناقص خیال میں ۱۹۶۰ء میں 'بڑا صاحب' کے لیے عباس خلیلی کا مشورہ قبول کرنا کہ وہ ای ایف یو کے حصص ARAG کو فروخت کر دیں، کچھ آسان نہ رہا ہوگا۔ اور مجھے اس بات کا بھی پورا یقین ہے کہ کمپنی کی باگ ڈور کو روشن علی بھیم جی کے ہاتھ میں دیے جانے پر بھی وہ خوش نہیں رہے ہوں گے۔ بھیم جی نے خود مجھے بتایا تھا کہ ان کی اصفہانی سے پہلی ملاقات اتنی مشکل تھی کہ لگتا تھا کہ شروع ہونے سے قبل ہی ختم ہو جائے گی اس لیے کہ اس خاندان کا پس منظر اور کاروباری معاملات میں ان کے نظریات قطعی نوعیت کے تھے۔ 'بڑا صاحب' اور جناب بھیم جی دونوں کو اس بات کی داد دی جانی چاہیے کہ اس مسئلے کو سلجھانے میں انھوں نے بڑے پن کا مظاہر کیا تھا۔ یہ مرزا احمد کی کمپنی سے شدید محبت ہی تھی جس نے انھیں کمپنی کو گرداب سے نکالنے کے لیے بھیم جی سے معاملت کرنے پر راضی کیا تھا۔

صدری کہتے ہیں کہ ''جو کچھ بھی میرے والد نے کیا وہ دل دہی سے کیا تھا۔ وہ اپنے تمام منصوبوں پر بہت احتیاط سے عمل کرتے تھے تا کہ ان کے نام کو بٹا نہ لگے۔ اداروں کو نفع بخش بنانے کے علاوہ یہ بات ہمیشہ ان کے پیشِ نظر رہتی تھی۔ تقسیم کے وقت جب وہ کلکتے سے ہجرت کر رہے تھے انھوں نے اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ جانے کے بعد کبھی کوئی بھی ان کو نا دہندہ نہ کہہ سکے۔''

میں 'بڑا صاحب' کے کاروباری کردار کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ اس لیے صادر نہیں کر سکتا کہ میں ان سے پوری طرح واقف نہیں تھا۔ ان سے ایک دو بار ملاقات ہوئی تھی مگر وہ بھی کئی لوگوں کے ہمراہ۔ یہ بھی کہ اس وقت میں کم عمر ہونے کے باعث ان کی توجہ کا مرکز نہیں بن سکتا تھا۔ ان کو اس بات کا علم تھا کہ ان کے دوست اِروِن آئیون ہی مجھے پاکستان لائے تھے اور صرف اسی بنا پر میں ان کی دوستانہ مسکراہٹ اور مصافحے کے قابل تھا۔ اس کے علاوہ جب تک میں کمپنی کے مدارج میں ، روشن علی بھیم جی کے ساتھ، ذرا بڑے رُتبے پر پہنچا تھا

اس وقت تک مرزا احمد اپنے اکثریتی حصص فروخت کر چکے تھے اور کمپنی کے معاملات میں ان کا دخل ختم ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ ملک کی معاشیاتی ترقی میں ان کا بڑا کردار اب تاریخ کا حصہ بننے والا تھا اور ان کو صرف ایک بزرگ مدبّر کا رُتبہ حاصل ہو گیا تھا۔ خاندان اور کاروبار کے زیادہ تر کام اب ان کے سب سے بڑے بیٹے صدری ہی انجام دینے لگے تھے۔

اپنے والد کی زندگی کے اس مرحلے کے بارے میں بات کرتے ہوئے صدری نے کچھ فلسفیانہ انداز اختیار کر لیا اور کہا کہ ''آپ جانتے ہیں کہ ایک انسان جو ۸۸ر برس کی عمر تک پہنچ چکا ہو، زندگی کے بارے میں اس کے اپنے تصورات ہوتے ہیں۔ اس لیے اپنی زندگی کے آخری دس سے پندرہ برسوں میں انھیں واقعی دولت کمانے میں کوئی دل چسپی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ سماجی کاموں میں زیادہ دل چسپی لینے لگے تھے۔ خیراتی نہیں بلکہ اپنا اسپتال بنانا، اسکول قائم کرنا وغیرہ۔ اگر کبھی میں ان کو پیغام بھیجتا کہ فلاں فلاں منصوبہ، یا فلاں فلاں منیجر ان سے مشاورت چاہتا ہے تو وہ کہتے کہ انھیں کوئی دل چسپی نہیں ہے مگر جوں ہی کسی فلاحی کام کی بات کی جاتی تو ایک آن میں وہ مستعد ہو جاتے۔ کاروباری معاملات میں وہ یہی کہتے کہ ان کے بیٹے سے بات کی جائے۔

ان کے اور کوئی مشاغل نہیں تھے۔ جب وہ مصروفِ کار رہتے تھے ہمیشہ بڑے فخر سے یہی کہا کرتے تھے کہ ان کا سب سے بڑا مشغلہ کام کرنا ہے۔ مجھے یاد ہے، جن دنوں میں اقامتی اسکول میں تھا، کہ ہفتے وار چھٹی کے دن وہ ریل کے ذریعے اپنے چائے کے باغات اور دوسرے مقامات پر اپنی جائیداد کے معائنے کے لیے جاتے تھے۔ وہاں سے واپسی پر وہ اپنی ڈاک پر توجہ دیتے تھے۔ مجھے صرف ایک ہی بات یاد آتی ہے جو شاید ان کے مشغلے سے قریب تر تھی۔ ان دنوں سنیما نیا نیا شروع ہوا تھا۔ کبھی کبھی چھٹیوں کے دن وہ چار اور پانچ تک فلمیں دیکھ ڈالتے تھے۔ ہفتے اور اتوار کے دنوں میں جب وہ شہر سے باہر نہیں جاتے تو شامیں اسی نوعیت کے آرام میں گزارتے تھے۔''

صدری سے میرے اس سوال پر کہ ''کیا مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور بنگلہ دیش کا قیام آپ کے والد کے لیے حیرت کا باعث بنا تھا؟ انھوں نے بلا تامّل جواب دیا تھا کہ پاکستان کی تشکیل کے وقت ہی انھوں نے جناح صاحب سے کہہ دیا تھا کہ اگرچہ ہم ابھی ایک قوم ہیں، ایک ساتھ ہیں مگر ہم کو بنگال کے لوگوں کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔ مگر بالآخر جب اس پر عمل شروع کیا گیا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ ہم سب کے لیے یہ بہت ناخوشگوار لمحات تھے، ان کے لیے بھی جو ۱۹۷۰ء میں ملک چھوڑ کر چلے گئے تھے اور ۱۹۷۳ء میں واپس آنا چاہتے تھے جب نئی حکومت نے واپس نہ آنے والوں کی ہمت افزائی کی کوشش کی تھی۔ مگر ان لوگوں کے لیے بھی جو اوّل دن سے وہیں قیام پذیر رہے، زندگی ایک دم بدل چکی تھی۔ ہمارا رہن سہن ویسا نہیں رہ گیا تھا جس کے ہم عادی ہو چکے تھے۔ دیکھیے، یہاں، جو کبھی مشرقی پاکستان تھا، تقریباً دو سو پچاس افراد تھے جو ملک کی معیشت کو چلاتے تھے۔ آدمجی، باوانی، اصفہانی وغیرہ۔ بدقسمتی سے ان کی جگہ اب ایک نئے طبقے کے لوگ آ چکے ہیں، بالکل اسی طرح جیسا کہ مغربی پاکستان میں ہوا ہے۔ یہ لوگ راتوں رات دولت کمانے میں دل چسپی رکھتے ہیں، عوام کی کسی کو پروا نہیں ہے''

صدری اصفہانی اور روشن علی بھیم جی، اگرچہ جگری نہیں، مگر دوست بن چکے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''اس خطے میں جب یہ مشرقی پاکستان تھا، روشن کے بہت سے دوست ہوتے تھے۔ بہت سے سیاست دانوں اور ان کی اولاد کی انھوں نے بہت مؤثر طریقوں سے امداد کی تھی۔ ان میں سے زیادہ تر صاحبانِ اثر تھے اور، کچھ تو ایسٹرن فیڈرل یونین کے ڈائریکٹر بھی بن گئے تھے۔ بھیم جی نے ان کو اپنا دوست بنا لیا۔ علیم، جسٹس ستار، ڈاکٹر مالک وغیرہ۔ ان کے علاوہ مجیب الرحمٰن، مولیٰ اور وحید الزماں ان کے اچھے دوستوں میں سے تھے۔ جی ہاں، روشن علی بھیم جی آج بھی بنگلہ دیش میں یاد کیے جاتے ہیں۔ میرے خیال میں ان کے دوست، صحیح معنوں میں دوست، ملک کے دوسرے علاقوں کی نسبت بنگال میں زیادہ تھے۔''

جب ہم ای ایف یو میں اصفہانی خاندان کے کردار کے بارے میں بات کرتے ہیں تو روشن علی بھیم جی کہتے ہیں کہ ''صدری

حیرت انگیز دوست ہے۔ میں اسے بے انتہا پسند کرتا ہوں۔ وہ سمجھتا تھا کہ ای ایف یو کے لیے کیا کچھ کرنا چاہتا تھا اور میرے کئی دوسرے خیالات سے بھی متفق تھا۔ وہ سچا بنگالی ہے۔''

جب میں صدری سے اُن کے دفتر میں ملاقات کے بعد وداع ہونے لگا جہاں انھوں نے بڑی خندہ پیشانی سے مجھے خوش آمدید کہا تھا تو میں ان کا بہت شکر گزار تھا۔ انھوں نے نہ صرف بڑے صبر سے میرے سوالات سنے تھے اور بغیر کسی جھجک کے ان کے جوابات دیے تھے، انھوں نے گرم جوشی کی ایک فضا بنا دی تھی جس میں ہم ای ایف یو کے ماضی میں ان کے والد کے کردار اور خود ای ایف یو کے بارے میں باتیں کر سکتے تھے، جس سے میں بہت خوش ہوا تھا۔ ان کا انداز اس بات کا غماز تھا کہ کمپنی کے ابتدائی دنوں میں ان کا خاندان اس کے لیے طاقت کا ستون تھا۔

اسی نوعیت کا مجھے اس وقت بھی احساس ہوا تھا جب میں نے ، اصفہانی خاندان کے دوسرے طبقے سے جو بنگلہ دیش بننے کے بعد الگ ہو گیا تھا، یعنی ابوالحسن مرحوم کی بیگم قمر اصفہانی سے باتیں کی تھیں۔

انھوں نے کہا،'' کتنے افسوس کی بات ہے کہ اس خاندان کے دونوں حصوں کے ایک دوسرے سے اچھے تعلقات نہیں ہیں۔ سچ یہ ہے کہ خاندان کے دونوں دھڑوں میں جھگڑے بنگلہ دیش کے قیام کی وجہ سے نہیں پیدا ہوئے تھے۔ ایسا شاید کبھی نہیں ہوتا مگر کچھ لوگوں کی انا اور خود پرستی اس کا باعث بنی تھی، بالکل اسی طرح جیسے بڑے خاندان کے بارے میں الجھے ہوئے ناٹکوں میں المناکیاں دکھائی جاتی ہیں۔ اور یہ سیاسی واقعات ہمارے خاندان پر بھی اثر انداز ہوئے۔ مثال کے طور پر آدمجی خاندان ہی کو لے لیا جائے۔ بے شک دولت اہمیت رکھتی ہے مگر ساتھ ہی تباہی کا باعث بھی ہو سکتی ہے۔ بھائی بند، خاندان والے آپس میں بہت خفیہ مگر ظالمانہ انداز میں لڑتے بھی ہیں۔''

بیگم قمر ایرانی النسل ہیں، ایک جاذبِ نظر خاتون، ایک پیشہ ور ایرانی سفارت کار کی بیٹی جس نے دوسری عالمی جنگ کے دوران کئی برس برلن میں خدمات انجام دی تھیں۔ یہ ابوالحسن کی دوسری بیوی ہیں۔ ان کی شادی اس وقت ہوئی تھی جب ابوالحسن لندن میں پاکستان کے ہائی کمشنر کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ انھیں قمر سے شادی کی بنا پر استعفیٰ دینا پڑا تھا اس لیے کہ قوانین کسی غیر ملکی سے شادی کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ بعد میں وہ محمد علی بوگرہ کی حکومت میں وفاقی وزیر برائے صنعت و تجارت بنائے گئے، جن دنوں غلام محمد ملک کے گورنر جنرل تھے۔ مگر ان کی بیوی کے مطابق، ابوالحسن ملکی کی سیاسی فضا سے خوش نہیں تھے اور انھوں نے بالآخر عملی سیاست چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔

بیگم قمر کے مطابق،'' استعفے کے بعد ابوالحسن نے لکھنا شروع کر دیا، اور بہت لکھا۔ آپ شاید واقف ہیں کہ انھوں نے مسٹر جناح سے اپنے روابط پر دو کتابیں تصنیف کی ہیں۔ اور انھوں نے پاکستان میں کئی مقامات پر اور دنیا بھر میں خطبے دینے شروع کر دیے۔ اس سلسلے میں وہ بہت مصروف ہو گئے۔ ان دنوں ہمارے گھر میں بہت سے سیاستدان آتے جاتے تھے۔ ایک طرف سے بھٹو آتے تھے اور دوسری جانب سے بہت سے دوسرے لوگ، جوان نسل کے بھی، جن کی وہ بہت ہمت افزائی کرتے تھے۔ میرے شوہر ایک بزرگ سیاسی مدبّر بن چکے تھے مگر بدقسمتی سے لوگ ان کے مشوروں کو قبول نہیں کرتے تھے۔ وہ جناح کی طرح سوچتے تھے مگر وہ اس زمانے کا مروّج انداز نہیں رہ گیا تھا۔''

ابوالحسن کے دو بیٹے تھے، Isky 'اِسکی' اور ضیاء تھے ، ایک بیٹی جس کا نام ایران تھا۔ بڑا بیٹا پاکستان کا سر برآوردہ تاجر ہے۔ خاندانی کاروبار میں شمولیت کے بعد وہ ''جوٹ ملز ایسوسی ایشن'' کے سب سے کم عمر چیئرمین بنے تھے۔ انھی دنوں وہ اور بھی بہت سے بین الاقوامی اداروں کے سربراہ تھے۔ جب مشرقی پاکستان جدا ہو گیا اور اس کے ساتھ اصفہانی کے پٹ سن کی کارخانے بھی، تو شہنشاہ ایران نے ان کو ایران میں پٹ سن کا کارخانہ لگانے کا مشورہ دیا اور انھوں نے کامیابی سے یہ کارخانہ لگا دیا۔ ایران میں اسلامی انقلاب کے بعد انھوں نے اپنے وطن (پاکستان) واپس آنے اور اپنے بہت قدیم خاندانی ادارے ایم ایم اصفہانی لمیٹڈ کی سربراہی سنبھالنے کا فیصلہ کر لیا۔ اپنے عم

زاد کے ساتھ انھوں نے اس کو چائے کی صنعت کا ایک عظیم ادارہ بنادیا۔ اپنے خاندانی اندازِ تجارت کے باعث انھوں نے کئی صنعتی ادارے قائم کیے، جن میں بیشتر بین الاقوامی اداروں کی ایجنسی اور سیلون شپنگ کارپوریشن کی نمائندگی شامل تھی۔

ان کے بھائی ضیا نے اپنے والد کی نقشِ قدم پر چلنے کا تہیہ کرلیا تھا۔ پیپلز پارٹی کے رکن کی حیثیت سے انھوں نے سوئٹزرلینڈ اور اٹلی میں پاکستان کے سفیر کے فرائض انجام دیے۔

بیگم قمر ان کے تین بچوں کو اپنے بچوں کی مانند سمجھتی ہیں۔ ''جب میں نے ان سے شادی کی تو میں نے کہہ دیا تھا کہ میں ان کو اپنے بچے کہوں گی اس لیے کہ نہ صرف میں اپنے شوہر سے بلکہ ان کے بچوں سے بھی محبت کی ہے اور میں ان کی اسی طرح نگہداشت کروں گی گویا وہ میرے ہی خون اور میری ہی گود ہیں۔ بعد میں جب ان لوگوں کے اولاد ہوئی تو میں زچہ خانے میں خود موجود ہوتی تھی۔ لوگ اس کو میرا مسخرہ پن کہیں تو کہیں، مگر میں سمجھتی ہوں کی انسان کو ہمیشہ اور ہر حالت سے بہتر نتائج نکالنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جب آپ کسی سے محبت کرتے ہیں تو آپ اس کی شخصیت سے اور اس کے اطوار و اسلوب سے بھی محبت کرتے ہیں۔ مگر میں نے اس انسان سے زیادہ محبت کی ہے، بس وہ جو کچھ بھی تھا اس محبت سے کی ہے۔ چوں کہ میں ان سے محبت کرتی تھی تو میں نے ان کی خاطر سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ جب ان کا انتقال ہوا تو میں اپنے ملک، ایران، واپس جاسکتی تھی مگر میں نہیں گئی۔ میں اس لیے نہیں گئی کی میں جانتی تھی کہ وہ اپنے ملک سے بہت محبت کرتے تھے اور اس وجہ سے میں نے یہیں قیام کا فیصلہ کرلیا۔''

اپنی گوں ناگوں سیاسی مصروفیات سے فراغت کے بعد ان کے شوہر نے سماجی سدھار میں عملی طور پر حصہ لینا شروع کر دیا تھا، خصوصاً بچوں کی بہبود میں۔ بیگم قمر نے بتایا کہ ''انھوں نے ایک ادارہ 'کاشانۂ اطفال' کے نام سے بنایا تھا جو آج ۳۸ر برس بعد بھی چل رہا ہے۔ میں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ تعلیم کی ترویج میں صرف کیا ہے اس لیے کہ اگر آپ کسی قوم کے لیے واقعی کچھ کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو تعلیم کو عام کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ ہر فرد کے لیے ضروری ہوتی ہے، مگر لڑکیوں کے لیے سب سے زیادہ اہم، اس لیے کہ انھیں اپنی اولاد کی تربیت کرنی ہوتی ہے۔ میں عوامی بہبود کے لیے سرمایہ فراہم کرنے کا کام کرتی ہوں۔ ہماری کوئی اور مدد نہیں کرتا، ہم جو کچھ کرتے ہیں اپنی کوششوں سے اور اپنے دم قدم سے۔ میں اس کام سے بہت پیار کرتی ہوں، مجھے کرنا پڑتا ہے اس لیے کہ ملک کے لیے یہ بہت اہم ہے۔ تعلیم کی کمی ہماری قوم پر ایک لعنت کی مانند ہے۔ لوگ تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے اپنے ماضی سے واقف نہیں ہونے پاتے۔ یہ میرے مرحوم شوہر کا ورثہ ہے۔ میں پاکستان کے عوام کو اس کا ذمے دار ٹھہراتی ہوں، وہ تعلیم کے سلسلے میں اتنا کام نہیں کر رہے ہیں جتنا کہ ہونا چاہیے۔ وہ اپنے لیے ایک وطن چاہتے تھے مگر اب اس کی ترقی کے لیے ذاتی کوشش نہیں کرتے جتنی کہ ہونی چاہیے۔ جو اقتدار میں ہیں وہ مفلسوں کے لیے، عوام کے لیے کچھ نہیں کرتے۔ یہ انصاف نہیں، نہ ہی یہ اسلام کے اصولوں کے مطابق ہے۔

میں نے سوچا کہ اتنا بڑا خاندان، ایک اس پار اور دوسرا اُس پار، کتنے افسوس کی بات ہے کہ یہ دونوں اس کیفیت میں آئے ہی کیوں؟

بیگم قمر اور ان کے بیٹے 'اسکی' ای ایف یو کے بورڈ آف ڈائریکٹرز پر ۱۹۸۹ء تک رہے۔ اس کے بعد ہی یعنی پچاس برس بعد، پاکستان کے اس قدیم بیمے کے ادارے سے اصفہانی خاندان کے تعلقات ختم ہوگئے۔

راجا صاحب محمود آباد

راجا صاحب محمود آباد

ایک ذی شرف درویش

جس شخصیت سے انسان اچھی طرح واقف نہ ہو اس کا تذکرہ کتنا مشکل کام ہوتا ہے۔ میں راجا صاحب سے ۱۹۶۹ء میں ای ایف یو کے دفتر قمر ہاؤس میں میں صرف ایک بار ملا ہوں۔ اس وقت کمپنی کے چیئر مین اپنے قریبی دوست راجا صاحب کو منیجنگ ڈائریکٹر روشن علی بھیم سے ملانے کے لیے لائے تھے۔ میں ٹوکیو سے میونخ جارہا تھا اور کراچی کے دوستوں سے ملاقات کے لیے تھوڑے دن کے لیے یہاں ٹھہر گیا تھا۔ میں راجا صاحب کے بارے میں اتنا کچھ سُن چکا تھا کہ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں ان سے پہلے مل نہیں سکا تھا۔ یہ اس لیے اور بھی حیرت انگیز تھا کہ مسٹر بھیم جی ان کے بڑے مداح تھے، اور سید سبطِ حسن بھی جو نہ صرف تعلقاتِ عامہ کے ڈائریکٹر بلکہ ایک ممتاز ادیب اور دانشور تھے۔ دونوں کا کہنا تھا کہ آل انڈیا مسلم لیگ نے جتنے قابلِ احترام رہنما پیدا کیے ہیں، ان میں قائدِ اعظم کے بعد، راجا صاحب جیسا سچا رہنما کوئی نہ تھا۔ یہ دونوں راجا صاحب کے بہت چاہنے والے تھے اور جیسا کہ مجھے بتایا گیا تھا، انھوں نے جس مقصد کے حصول کے لیے اپنا سارا اثاثہ، اپنی آرام دہ زندگی کو خیر باد کہہ دیا تھا، تاہم اس نے ، جو ایک دن حاصل ہو گیا تھا، ذاتی طور پر اُن کے ساتھ وفا نہیں کی۔ ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے تناظر میں اس داستانوی شخصیت کے بارے میں مجھے کے۔ ایف۔ حیدر صاحب بہت کچھ بتا چکے تھے۔ راجا صاحب نواب بھوپال کے اس مختصر سے حلقے کے فرد تھے میں جن کا تذکرہ حیدر صاحب اور عبدالرحمٰن صدیقی کے خاکوں میں کر چکا ہوں۔ انھوں نے تمام زندگی اپنی پارٹی اور اپنے عزیز ترین رہنما محمد علی جناح کی، جنھیں وہ انکل کہا کرتے تھے، پورے دس برس تک خدمت کی، جب تک کہ پاکستان حاصل نہیں ہو گیا تھا مگر یہ قوم جس نے لاکھوں مسلمانوں کو پناہ دی تھی وہ اپنے ایک ممتاز محسن کے لیے کچھ نہ کر سکی۔

اُسی صبح اخبارات میں ان کے بارے میں کچھ مضامین شائع ہوئے تھے، دفتر جانے سے قبل میں نے جن پر سرسری نظر ڈالی تھی مگر مجھے کیا خبر تھی کہ مجھے اس مسلم لیگ کے ماضی کی اس نامور شخصیت سے ملاقات کا موقع میسر ہوگا جو قائد کے دو جاں نثاروں میں سے ایک تھی، دوسری شخصیت ابوالحسن کی تھی میں جن سے ای ایف یو کے حوالے سے واقف تھا۔ کراچی پریس کلب میں راجا صاحب کے اعزاز میں ایک استقبالیے کا انتظام کیا گیا تھا۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ اس صوفی منش انسان سے میں کتنا مرعوب ہوا تھا جب ایک صحافی نے ان کے بارے میں تفصیل سے لکھا تھا کہ اپنا سب کچھ پاکستان پر قربان کر دینے کے بعد وہ اب لندن میں خود ساختہ جلا وطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ میں اس مضمون سے بہت متاثر ہوا تھا اس لیے کہ اس کو پڑھ کر مجھے ایک اور بڑی پاکستانی شخصیت یاد آگئی میں جس سے روشن علی بھیم جی کی معرفت میں لندن کے ایک فلیٹ میں ملا تھا، جس کو اس کے ایک قریبی دوست جنرل ایوب خان، مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے ملک سے نکال باہر کیا تھا۔

اخبار کے اس مضمون میں راجا صاحب محمود آباد کو اشرافیہ کی شائستگی اور شہری سادگی کے بہترین نمونے کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔

ایک ایک کر کے اس مضمون کے سارے جملے مجھے یاد آنے لگے جب اچانک ان سے میرا تعارف کرایا گیا۔ وہ کھدر کی شیروانی میں ملبو
ایک معمولی سی چپّل پہنے ہوئے تھے۔ سو یہ تھا وہ انسان، اشرافیہ کا ایک وارث، جس کا باپ بھی اتنا ہی مشہور تھا، میں نے جس کے بار
میں، سنا تھا کہ وہ قائدِ اعظم کا سب سے قریبی دوست تھا۔ قائدِ اعظم کی شادی کی انگوٹھی، جوانھوں نے اپنی پیاری اور نہایت خوب صورت بیو
کو پہنائی تھی، اسی کے بلند مرتبہ والد، مرحوم مہاراجا محمد علی محمد خان کی جانب سے تحفہ تھی، جن کی جاں نثاری اور شوقِ وطن پرستی نے ان کے
بیٹے امیر احمد کو بہت متاثر کیا تھا۔ میں نے ان کے بیٹے کے بارے میں تو بہت کچھ سنا تھا مگر خود ان کی ذات میرے لیے اجنبی تھی، جب تک
کہ میں نے اس کتاب کے سلسلے میں ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ کے بارے میں خاصا مطالعہ نہیں کر لیا تھا جو اس آزادی اور اس طاقت
کے بارے میں تھی جسے برطانیہ نے ہڑپ کر لیا تھا۔ چودھری خلیق الزماں نے اپنی کتاب Pathway to Pakistan میں بہت وا
انداز میں ان خدمات کی تلخیص پیش کی ہے جو اس مردِ مجاہد نے مسلمانوں کے مقاصد کے حصول کے سلسلے میں انجام دی تھیں۔ وہ مرحوم آ
خان کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے۔ جب آغا خان آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت پر فائز تھے تو یہ اکثر ان کی نیابت کے فرائض انجا
دیتے تھے۔ جب آغا خان نے صدارت سے استعفیٰ دیا تو مہاراجا نے اس وقت تک تاحیات صدارت کا بار اُٹھایا جب ۱۹۱۸ء میں خرابیِ صحت
کے باعث انھیں اس باعزت اور نہایت اہم عہدے کو چھوڑنا پڑا تھا۔

''پندرہ برس کے عرصے کے لیے انھیں مسلم سیاست اور تعلیمی سرگرمیوں کو عملی طور پر چھوڑنا پڑا تھا جو ان کی زندگی کے اطراف گھومتی
تھیں۔ وہ ہمیشہ اس فکر میں رہتے تھے کہ ایسے کارآمد لوگوں کو سامنے لے آئیں جو مستقبل میں قوم کی رہنمائی کے قابل ہو سکیں۔ آل انڈیا مسلم
لیگ میں جناح صاحب کو یہی لے کر آئے تھے۔ سر وزیر حسن کا سیاسی کردار بھی ان ہی کا مرہونِ منّت تھا۔ محمد علی سے بھی انھیں بہت قربت تھی
۔ فراخ دلی سے ان کے اخبار 'کامریڈ' کی لاکھوں روپے کی مالی امداد بھی یہی فراہم کرتے تھے۔ لکھنؤ یونی ورسٹی اور طبّی کالج بھی انھیں کے
دستِ تعاون کے مظہر تھے اور یہ انھیں بھی فراواں مالی امداد فراہم کرتے تھے۔ ان کے خیراتی کاموں اور دریا دلی کے تفصیلی بیان کے لیے ایک
الگ کتاب چاہیے ہوگی۔''

سید اشتیاق حسین نے مہاراجا کے فرزندِ ارجمند امیر احمد کی سوانح حیات میں لکھا ہے کہ'' ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں خالص
اہلیت کی بنا پر مہاراجا کو ایک قومی رہنما کا رُتبہ حاصل تھا۔ وہ ذات اور نسل سے ماورا، عوام اور اپنے عصر کی اہم شخصیات میں بہت محترم او
مقبول تھے۔ ملک کی سرکردہ سیاسی شخصیتوں میں یہ شخصی کشش کا مرکز تھے۔''

ملک کے رہنما، پنڈت موتی لال نہرو، محمد علی جناح، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، سروجنی نائیڈو، مسز اینی بسنت وغیرہ ان
کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ وہ ڈاکٹر محمد اقبال سے بہت پیار کرتے تھے۔ خصوصاً علی بردران سے ان کو بہت قربت تھی اور جب انگریز
حاکموں نے ان دونوں کو چند واڑہ میں نظر بند کر رکھا تھا تو یہ ان کی مالی امداد بھی کرتے تھے۔

محمد علی جناح ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ جب انھوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمانی بورڈ کی تشکیل کے وقت اپنی
حکمتِ عملی اور لائحۂ عمل کے بیان کے لیے ۱۹۳۶ء میں ایک کتابچہ ترتیب دیا تھا تو ان کو مندرجہ ذیل الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا تھا:

''وقت کے گزرنے کے ساتھ، جو امداد اور تعاون ہندوستان کے چوٹی کے رہنماؤں نے کیا تھا، خصوصاً اس عظیم انسان، مہاراجا
آف محمود آباد نے، جس کی بے غرض جاں نثاری، وطن پرستی کا جذبہ، اور مقصد کے لیے مستقل مزاجی مسلم لیگ کے لیے ایسی پشت پناہی،
طاقت اور حمایت کا باعث ہوا ہے کہ آج مسلم لیگ اپنی ان بلندیوں پر پہنچ چکی ہے جس کا مینارۂ نور لکھنؤ معاہدہ ہے، جس کو لیگ کانگریس
معاہدہ ۱۹۱۶ء بھی کہا جاتا ہے۔ یہ معاہدہ ہندوستان کی تاریخ میں سیاسی ارتقا کا سنگِ میل، مقصد کی شناخت کا ثبوت، ہندوستان کے دو بڑے
عوامی دھڑوں کے درمیان خیر سگالی کے جذبات اور ہندوستانی عوام کے لیے ایک ذمے دار حکومت کے حصول کی جد و جہد کا آئینہ دار ہوگا۔''

اور آج، اس جگہ ان کا بیٹا، روشن علی بھیم جی کے معمولی سے دفتر میں، عباس خلیلی اور ایک اور صاحب جن کا نام میرے ذہن سے
ر چکا ہے، بیٹھا ہوا ہے۔ یقیناً اس نا معلوم شخص سے راجا صاحب اچھی طرح واقف رہے ہوں گے، اس لیے کہ مجھے اتنا ضرور یاد ہے کہ
ونوں ایک دوسرے سے بہت قریب معلوم ہوتے تھے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ راجا صاحب جہاں بھی موجود ہوتے ہمیشہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بن
اتے۔ ایک انسان جو میرے دوستوں کے خیال میں، بلا شبہ ہندوستان کے نامور سپوتوں میں سے تھا کہ اپنے والد کی طرح اس نے بھی
ندوستان کے مسلمانوں کی تحریکِ آزادی میں نہایت نمایاں کردار ادا کیا تھا۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے خازن اور آل انڈیا مسلم لیگ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر کی حیثیت میں انھوں نے آزادی کے قلعے میں
پنے لیے ایک مخصوص مقام بنا لیا تھا۔

انھوں نے جرمن زبان میں مجھے خوش آمدید کہا۔ مجھے بعد میں بتایا گیا تھا کہ وہ جرمن زبان اچھی طرح بول سکتے ہیں۔ ہم نے
وسروں کی موجودگی کی بنا پر جرمن زبان بولنے سے احتراز کیا۔ انھوں نے مختصراً بتایا کہ علی گڑھ میں ایک پروفیسر صاحب جرمن زبان سکھانے
مامور تھے۔ میرے دوست روشن علی بھیم جی نے ہمیشہ کی طرح مجھے بڑے خلوص اور نہایت گرمجوشی سے گلے لگایا۔ مجھے فوراً احساس ہو گیا کہ
حول بہت بے تکلف، پُرسکون، دوستانہ ہے۔ بظاہر یہ چند دوستوں کی ملاقات کا موقع ہے۔ میں بیٹھ گیا اور ان کے باتیں سننے لگا جو ہمیشہ کی
رح ملی جلی اردو اور انگریزی زبانوں میں ہو رہی تھی۔ پھر اچانک خلیلی صاحب اپنی کرسی سے اچھلے اور میری کمر میں ہاتھ ڈال کر بولے،
رنوسکی، کیا تم اپنی زندگی میں کسی حقیقی درویش سے ملے ہو؟ ان کی طرف غور سے دیکھو، ایک درویش یہاں موجود ہے۔ اور انھوں نے راجا
صاحب کی طرف اشارہ کیا، جو اس طرح مسکرائے جیسے وہ اس جملے سے لطف لے رہے ہوں۔ مجھے بہت بعد میں احساس ہوا تھا کی خلیلی کی
ں جملے سے کیا مراد تھی۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ یہ کتنا عمدہ اور لطیف انداز تھا مجھے بتانے کا کہ راجا صاحب محمود آباد نہ صرف پرانی نسل سے
علق رکھنے والے ایک معروف سیاست داں تھے بلکہ جنھوں نے ایک قوم کی تشکیل کی تھی، بلکہ ایک نہایت مذہبی انسان، ایک بلند مرتبہ مسلم
نشور، اور ایک ہی وقت میں صوفی بھی اور درویش بھی تھے۔ اور اب مجھے یاد آتا ہے کہ روشن علی بھیم جی بتاتے تھے کہ جہاں تک سیاسی
طریات کا معاملہ تھا، یہ دونوں بائیں بازو کی طرف جھکاؤ رکھتے تھے مگر مذہب کے معاملات میں دونوں کے درمیان ایک بُعد حائل تھا۔

اس کے بعد سے صرف میری موجودگی کی وجہ سے باتیں صرف انگریزی زبان میں ہونے لگیں۔ وہ پاکستان کے موجودہ سیاسی
الات پر گفتگو کر رہے تھے۔ بظاہر راجا صاحب، اپنی 'آنٹی' فاطمہ جناح سے مل کر آ رہے تھے جنھوں نے بڑی بہادری سے صدر ایوب خان
کے خلاف صدارتی انتخاب لڑا تھا اور بہت کم ووٹوں سے ہاری تھیں۔ راجا صاحب جب پاکستان کے بارے میں بات کر رہے تھے تو مجھے بہت
یوس، بلکہ بیزار دکھائی دے رہے تھے، اس ملک کے لیے جس کی تشکیل میں، اپنی بساط کے مطابق، انھوں نے تن من دھن سے جد و جہد کی
تھی۔ مجھے وہ بہت دل شکستہ انسان دکھائی دے رہے تھے۔ ان کو دیکھ کر، جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں، مجھے ایک اور شخصیت یاد آئی جس سے
ں روشن علی بھیم جی کے ہمراہ لندن میں ملاقات کر چکا تھا۔ مگر اسکندر مرزا کے مقابلے میں، جو سیاست سے مکمل کنارہ کش ہو چکے تھے اور کسی
ی سیاسی گروہ سے متعلق نہیں رہ گئے تھے، راجا صاحب کی شخصیت محرومی اور جوش کے درمیان بٹی ہوئی تھی۔ ان کے بارے میں اخبار میں
چھنے والے مضامین سے میں نے محسوس کیا تھا گویا لوگ اس بات کے خواہش مند تھے کہ راجا صاحب کو عملی سیاست میں واپس آ جانا چاہیے۔
راس دن روشن علی بھیم جی کے دفتر میں ہونے والی بات چیت میں خلیلی اور بھیم جی دونوں نے بار بار راجا صاحب سے سوال کیا تھا کہ آخر وہ
کستان میں آ کر قیام کیوں نہیں کرتے اور جمہوریت کے قیام میں ملک کی امداد کیوں نہیں کرتے۔ جب ان سے ایسے سوالات کیے جا رہے
تھے مجھے آج بھی ان کا چہرہ یاد آتا ہے جو ان کی جسمانی ہیئت کے مقابلے میں بہت عمر رسیدہ دکھائی دے رہا تھا، ان کی آنکھوں کے اطراف
کچھ مایوسی لہرا رہی تھی۔ میرے خیال میں وہ اس بات پر قطعی راضی نہیں دکھائی دے رہے تھے کہ ان کے مضبوط بازوؤں کو دوسروں کی ذمے

داریاں اٹھانے کے لیے استعمال کیا جائے۔ اور ایک لحظے کے لیے ایسا لگا کہ ان کی آنکھیں بولنا چاہتی ہیں، سرگوشی کے انداز میں، جو ایک نر
گفتار اعتذار کے مترادف تھا۔

وہ اپنے اس بے نام دوست اور عباس خلیلی کے ساتھ واپس چلے گئے۔ میں نے روشن علی بھیم جی سے کہا کہ میں کتنا خوش قسم
ہوں کہ آج میری اس شخص سے ملاقات ہوگئی جس کے غیاب میں اُس کو بہت پسند کرتا تھا۔ اور میں نے یہ بھی کہا کہ مجھے اس شخص کی بظا
تنہائی اور مایوسی پر بہت ملال ہے۔ روشن علی بھیم جی نے ایک لمحہ توقف کیا۔ کچھ دیر ایک سناٹے کی کیفیت رہی۔ اس وقت ان کے اور میر
خیالات کے درمیان صرف ایئر کنڈیشنر کی آواز تھی جو برابر آرہی تھی۔ پھر انھوں نے آہستگی اور مری ہوئی آواز میں کہا، ویسے ہی لہجے میں جو
ہمیشہ اس وقت استعمال کیا کرتے تھے جب وہ اپنے مخاطب تک کسی اہم بات کی ترسیل چاہتے تھے، ''تعجب کہ تم ایسا کہہ رہے ہو، مگر افسوس ک
ہم لوگ، اس ملک کے باسی، ابھی تک اپنی ممتاز شخصیات کی اچھائیوں اور ان کے بڑے پن کا، جو انھوں نے اس ملک پاکستان کے لیے ک
ہے، تجزیہ کرنے کی صلاحیت نہیں پیدا کر سکے ہیں۔''

ہوٹل واپس پہنچ کر میں نے راجا صاحب محمود آباد کی سوانحی تفصیلات حاصل کرنے کی کوشش کی جس سے ان کے اس کردار پر روشنی
پڑ سکے جو ہندوستان کے مسلمانوں کی تحریکِ آزادی اور پاکستان کی تشکیل کے عمل کے دوران رہا ہے۔ مگر آج تیس برس بعد میرے ہاتھ ایک
کتاب آئی ہے، اشتیاق حسین صاحب کی لکھی ہوئی جو بظاہر ان سے اچھی طرح واقف بھی تھے اور ان سے محبت بھی کرتے تھے۔ کتاب ک
عنوان ہے The Life and the Times of Raja Saheb of Mahmudabad, Glimpses of
'Freedom Movement بہت اچھی لکھی ہوئی اور ایک خوب صورت کتاب۔ میرے تن بدن میں ایک پُر اسرار لہر سی دوڑ گئی جب
مجھے پتا چلا کہ میرے دوست کراچی میں اس کتاب کو تلاش کر لینے میں کامیاب ہو گئے۔ شہزادی عابدہ سلطان نے ملیر میں ملاقات کے دوران
مجھ سے اس کتاب کا تذکرہ کیا تھا۔ کچھ سربرآوردہ لوگوں نے اس کتاب میں راجا صاحب کے بارے میں تعارفی اور عمیق احترام کے جذبات
پیش کیے تھے۔ اور اپنے پیش لفظ میں مصنف نے امید ظاہر کی تھی کہ یہ کتاب آنے والی نسلوں کے دلوں کو برانگیختہ کرے گی۔ ان کی اس
عاجزانہ امید کے پیشِ نظر میں اس کتاب کے کچھ اقتباسات اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہوں گا۔ شاید بعد میں ان میں سے کچھ
اس کتاب کا خود مطالعہ کرنا چاہیں۔ میں اس مقام پر صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ اس، اشرافیہ کے فرد اور درویش شخصیت، سے تفصیلی ملاقات
ایک حیرت ناک تجربہ ہوگا جو میں اس کتاب میں نقل کرنے سے قاصر ہوں۔

''قدرت اور حالات راجا محمد امیر احمد خاں پر مہربان رہے ہیں جو محمود آباد ریاست کی اشرافیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ۵ر نومبر ۱۹۱۴ء ک
وہ پیدا ہوئے اور ان کی پرورش شاہی محل کے ناز و نعم میں ہوئی۔ وہ مہاراجا محمد علی محمد خاں والیِ ریاست محمود آباد کے سب سے بڑے بیٹے او
ریاست کے ولی عہد تھے۔ لہٰذا نوجوان امیر احمد خاندان کی محبتوں کا مرکز تھے۔ انھیں ایک جدید اور رئیس خانداں کی ساری سہولتیں حاصل تھیں
اس کے باوجود ان کا اندازِ حیات نوابینِ اودھ کی روایتوں کا امتزاج تھا۔ ایک طرف تو انھیں ایڈورڈ عہد کے کسی لارڈ کے بیٹے جیسی تعلیم دی گئ
تھی۔ ان کے لیے بہترین اساتذہ اور اتالیق مقرر کیے گئے تھے، جن میں سے ایک وہ تھے جو شیکسپئر پر 'اتھارٹی' تھے۔ دوسری طرف قومی
دانشوروں نے ان کو مشرقیت اور تہذیب کی، آپس میں گندھی ہوئی شاخوں کے علوم کی تعلیم دی تھی۔ نوجوان راجا کو قدرت نے مردانہ حسن
جاہت اور کرشماتی شخصیت سے نوازا تھا۔ ایسی شخصیت اور آداب کے امتزاج کے باعث ان کو مشرق اور مغرب دونوں میں پسندیدہ افراد میں
شمار کیا جاتا تھا۔

راجا امیر احمد کی والدہ ایک ممتاز موسوی سیّد خاندان کی بیٹی تھیں جو ایران کے شہر اور تعلیمی مرکز، نیشاپور سے ہجرت کر کے ہندوستان
میں آباد ہو گیا تھا۔ ان کے خاندان نے بہت سے مشہور دانش ور پیدا کیے تھے۔ ابتدائی تعلیم اور ریاستی آداب اور سرکاری تشریفات کے الجھ

وئے نظام سے عہدہ برآ ہونے کے بعد نوجون امیر احمد کو باقاعدہ تعلیم کی غرض سے College La-Martimiere لکھنؤ میں داخل کر یا گیا۔ کالج کے احاطے میں سرسبز میدان، پھولوں کی کیاریاں، فراخ باغیچے اور ایک بڑا سا تالاب تھا۔ مرکزی عمارت ایک خوب صورت، ہانہ تزئین تعمیر کا نمونہ یا جو رومن ریاستی تعمیرات سے مشابہت رکھتی تھی۔ کالج کا ماحول اعلیٰ یورپی معاشرے اور تہذیب کا آئینہ دار تھا۔ ساتذہ کی اکثریت یورپی پر برطانوی تھی۔ ایسے غیر معمولی مکتب سے امیر احمد خان نے سینئر کیمبرج کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔

اس سے پہلے کہ نوجوان امیر احمد خان کی تعلیم مکمل ہوتی مہاراجا صاحب کا انتقال ہو گیا۔ پھر بھی راجا صاحب کی ایک غیر ملکی نصابی علیم کے اختتام کی خوشی میں ریاستی محل میں ایک پُر وقار تقریب منعقد ہوئی۔ نوجوان راجا صاحب اب فنونِ لطیفہ میں اپنی تعلیم جاری رکھنے اور گری حاصل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس لیے انھوں نے رابندر ناتھ ٹیگور سے رابطہ کیا تا کہ ان کو شانتی نکیتن میں داخل کر لیا جائے۔ ڈاکٹر یگور ان کو داخلہ دینے پر بخوشی راضی ہو گئے۔ مگر جناح صاحب کی مداخلت سے یہ منصوبہ پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا جنھوں نے تاکیداً کہا، یں تمھاری یونی ورسٹی ہوں۔ اگر تم میرے ساتھ کام کرو تو تمھیں ہر طرح کی تعلیم حاصل ہو جائے گی۔''

ان کے والد کی جناح صاحب سے قریبی دوستی تھی اس کی وجہ سے امیر احمد بچپنے سے اپنے 'انکل' کے ساتھ ساتھ رہتے۔ مہاراجا صاحب کی وصیت کے مطابق محمود آباد ریاست وقف کے متولّی ہونے کی وجہ نے ان کو اور بھی قریب کر دیا تھا۔ اس موقعے نے جناح صاحب ونہ صرف محمود آباد ریاست کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کر دی بلکہ وہ نوجوان امیر احمد کے ذہنی جھکاؤ، پُر جوش جاں نثاری اور نرم خوئی سے بھی اچھی طرح واقف ہو گئے۔''

اس وقت ان کے والد بقیدِ حیات تھے جب ۱۹۲۷ء میں ان کی شادی رانی کنیز عابد سے ہوگئی، جو بلہرہ اسٹیٹ کے راجا ابوالحسن ان کی بیٹی تھیں۔

''امیر احمد کی شادی ان دنوں کے بہت رنگین مواقع میں سے تھی جو صحیح معنوں میں روایتی مسلم تہذیب کی آئینہ دار تھی۔ تمام مقامی یاستوں کے حکمراں، ممتاز شہری، سیاست داں، اشراف، بڑے زمیندار اور سماج کے مختلف طبقوں کے نمائندے شادی میں مدعو تھے۔ عالیجاہ ظام حیدر آباد کی جانب سے ان کے ایک ذاتی افسر نے نمائندگی کی جب رامپور کے حکمراں نے بہ نفسِ نفیس شرکت کی تھی۔ مسٹر جناح نے بھی رکت کی خاطر بمبئی سے محمود آباد تک کا سفر کیا تھا۔ وہ تحفے میں کچھ قیمتی اشیا لائے تھے جن میں خالص ریشم کی اچکن تھی جس پر طلائی نقوش ڑھے گئے تھے۔ محمود آباد کا پورا شہر بھرپور طرح سے سجایا گیا تھا۔ بڑے پیمانے پر روشنی کے علاوہ ریاست کی پوری رعایا دعوت میں شریک تھی وئی دنوں تک چلتی رہی تھی۔ شادی کا جلوس صحیح معنوں میں ایک جشن تھا، ایک غیر معمولی ماجرا تھا۔

بالغ ہونے پر اور ریاست کی باگ ڈور سنبھالنے کے سلسلے میں ایک سرکاری تقریب منعقد کی گئی تھی۔ ریاست کی روایت کے مطابق وبے کے گورنر نے نوجوان شہزادے کی حکمرانی کا علان کیا تھا۔

اسلامی اور مشرقی تہذیب میں پوری طرح رچا ہوا امیر احمد خاں اپنی والدہ کا بہت احترام کرتا تھا۔ اس لیے اس نے کسی اور کے لاوہ پہلے اپنی والدہ کے ہاتھوں تاج پہننا پسند کیا تھا۔ اس کے بعد وہ ایک خاص دربار میں گئے جہاں یو پی کے گورنر نے ان کو سرکاری طور پر اجا مقرر کیا۔ جب تقرر کی سرکاری تقریب ختم ہوئی تو شہزادے نے جا کر تاج کو اپنی والدہ کے قدموں میں رکھ دیا۔ یہ عمل عقیدت کے اس ندترین رُتبے سے اپنے احترام کا اظہار تھا جو شہزادے کے دل میں اپنی ماں کے لیے تھا۔

امیر احمد نے ۱۹۳۳ء میں پہلی بار مشرقِ وسطیٰ اور یورپی ممالک کا سفر اختیار کیا۔ لندن پہنچ کر انھوں نے مے فیئر کورٹس میں قیام فرمایا یہ وہ زمانہ تھا جب جناح صاحب خود ساختہ جلا وطنی اختیار کیے ہوئے تھے اور ہیمپسٹڈ ہیتھ میں مقیم تھے۔ امیر احمد اپنے انکل سے ملنے کئی بار ئے اور ان سے مختلف مسائل پر بات چیت کی جس میں ہندوستان کے سیاسی مسائل شامل تھے۔ تقریباً ہر ملاقات میں جناح صاحب

ہندوستان کے مسلمانوں کے بارے میں اپنی تشویش اور فکر کا اظہار کرتے۔

ایک شام جب وہ دونوں برکلے ہوٹل میں رات کا کھانا کھا رہے تھے ہمیشہ کی طرح انھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے اپنی بے انتہا تشویش کا اعادہ کیا اور راجا صاحب سے کہا کہ ان لوگوں کے لیے کچھ کرنا ہی ہوگا۔ امیر احمد نے ان کی تشویش سے متاثر ہوکر ان کو ہندوستان واپس جانے اور آل انڈیا مسلم لیگ کی سربراہی سنبھالنے اور اس میں نئی روح پھونکنے کا مشورہ دیا۔ جناح صاحب نے تفصیل سے وسائل اور پُرخلوص کارکنوں کی کمی سے پیدا ہونے والی الجھنوں کی وضاحت کی۔ انھوں نے اس شرط پر واپسی پر راضی ہونے کا وعدہ کیا کہ وہ (امیر احمد) ان کے شانہ بشانہ کھڑے ہوں گے۔ امیر احمد نے ایک لمحہ بھی تامل کیے بغیر عہد کر لیا اور از خود ہر قسم کی مادّی معاونت کی پیشکش کردی جو اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے درکار ہوگی۔ جناح صاحب اس نوجوان کے جذبے سے بے حد متاثر ہوئے اور ہندوستان کے سرنگوں مسلمانوں کی خدمت اور مسلم لیگ کو ایک وسیع اور متحرک ادارہ بنانے کی غرض سے بہت جلد ہندوستان واپسی کا وعدہ کرلیا۔

اگرچہ جناح صاحب دسمبر ۱۹۳۳ء کے آخری ہفتے میں ہندوستان واپس ہوئے، ان کے اگلے کئی برس دونوں ملکوں کے درمیان بحری سفر میں گزر گئے۔ آخر کار اکتوبر ۱۹۳۵ء میں مستقل طور پر ہندوستان منتقل ہو گئے اور مسلم لیگ کے احیا کا منصوبہ بنالیا۔

راجا صاحب نے ۵/مئی ۱۹۳۶ء کو باقاعدہ آل انڈیا مسلم لیگ کی رُکنیت حاصل کرلی اور جو کچھ ان کے پاس تھا وہ سب قائد کے سپرد کردیا۔ اس کے بعد سے راجا صاحب قائد سے اپنی وفاداری اور ان کے مقصد کی لگن سے کبھی نہیں ڈگمگائے۔

مئی ۱۹۳۶ء میں جناح صاحب نے ۵۴/ارکان پر مشتمل آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی بورڈ کا اعلان کردیا اور راجا صاحب محمود آباد اس کے خازن مقرر کردیے گئے۔

راجا صاحب کے روپ میں جناح صاحب کو ایک پُرخلوص انسان مل گیا جو اس ادارے کے کچھ مفادات کی دیکھ بھال کے لیے موزوں تھا۔ نوجوان راجا نے جس کی عمر اگرچہ صرف بائیس برس کی تھی، ثابت کردیا کہ وہ ان فرائض کو پوری طرح ادا کرنے کے اہل تھے جو ان کو سونپے گئے تھے۔ اپنے لاہور کے سفر کے دوران جناح صاحب نے پنجاب کے دیرینہ مسلم لیگی ملک برکت علی اور علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال سے راجا صاحب کا تعارف کرایا۔ دونوں رہنماؤں نے نوجوان راجا صاحب کو اپنے حلقے میں شمولیت پر خوش آمدید کہا اور ان کو مسلم لیگ کی ترتیبِ نو کے سلسلے میں اپنے پورے تعاون کا یقین دلایا۔ علامہ اقبال نے راجا صاحب سے مسلم لیگ کے اگلے اجلاس کو لاہور میں منعقد کرنے کی خواہش کی۔ راجا صاحب نے اس اقدام کی تعریف کی اور اس سلسلے میں تمام ضروری اور امکانی تعاون کا یقین دلایا۔

راجا صاحب سیاست میں پورے جوش وخروش اور جذبے کے ساتھ داخل ہوئے۔ انھوں نے اپنے ملک کے عوام کی خدمت کو اپنا مقدس فرض سمجھتے ہوئے اپنی دولت لٹادی تاکہ غریب لوگوں کی حالت میں بہتری لائی جاسکے۔ انھوں نے ملک کے کونے کونے تک سفر کیا تاکہ وہ مسلمانوں کو درپیش مسائل کا خود احاطہ کرسکیں۔ انھوں نے ملک کے طول وعرض میں مسلم لیگ کی شاخیں قائم کیں، لوگوں کو ملازم رکھ کر اور مقررین کی خدمات کے ذریعے مسلم لیگ کا پیغام عام کیا۔ اس طرح وہ مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے میں کامیاب ہوگئے۔ انھوں نے خود سیکڑوں ہزاروں چھوٹے بڑے اجتماعات سے خطاب کیا اور سامعین پر واضح کیا کہ تحریک ایک بڑے بحران سے گزر رہی ہے:

انھوں نے کہا، 'ہر مسلمان کو مسلم لیگ کے لائحۂ عمل اور منصوبوں کے پیچھے متحد ہوکر کھڑا ہونا چاہیے۔ سب کو اپنے رہنما قائدِاعظم محمد علی جناح کی پیروی کرنی چاہیے جو مسلمانوں کے جذبات کی سچی ترجمانی کرتے ہیں۔ ہمیں ان کے عقب میں چٹان کی طرح کھڑا ہوجانا چاہیے۔''

ایک ممتاز تعلیم یافتہ انسان ہونے کے علاوہ وہ پور پور مہذب تھے۔ ان کی پرورش اودھی تہذیب کے پالنے میں ہوئی۔ ان کی قائدِ اعظم سے قربت ہوئی، تو اس لیے نہیں کہ وہ ایک رہنما یا سیاست داں تھے۔ امیر احمد خان اپنے والد کے دوست کی حیثیت سے ان کا بے حد

ترام کرتے تھے اور ان کو اپنا 'انکل' مانتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ قائد سے ان کا طرزِ عمل خوش خلقی اور فرماں برداری سے مملو ہوتا تھا۔ پختہ کار ونے کی وجہ سے وہ اچھائی اور برائی کے مختلف رنگوں میں تمیز کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اصولوں اور لائحۂ عمل کے عاملات میں قائد سے اختلاف کرنے کی ہمت رکھتے تھے۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ وہ قائد سے وفاداری میں متزلزل ہوئے ہوں۔ انھوں نے ائد کو اوّل تا آخر پیار اور احترام دیا تھا۔

امرا اور رُوسا کے درمیان پیدا ہونے کے باوجود، راجا صاحب اس سماج میں کبھی آرام سے نہیں رہے، وہ جس کا حصہ تھے۔ نوجوانی ں بے راہ رو ترغیبات کے سامنے انھوں نے کبھی ہتھیار نہیں ڈالے۔ بچپن ہی سے وہ سادہ رہن سہن اور پُر مشقت زندگی کے عادی تھے۔ اص اوقات کے لیے قیمتی ملبوسات اور مہنگے کپڑے پہننے کے بجائے وہ گھروں میں بنے ہوئے کھدّر سے بنے لباس پسند کرتے تھے۔ یہ زات ان کی ماں سے منسوب کیے جاتے ہیں جو ایک منکسر مگر علمی گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس کے علاوہ اس طرح وہ محمود آباد ہاؤس میں کثر آنے والے کھدّر پوش رہنماؤں کے لیے اجنبی نہیں ہوتے تھے۔ نوجوان امیر احمد اگرچہ ملاقاتیوں اور مہمانوں کی ریاست محمود آباد کی وایات کے مطابق عمدہ قسم کی ماکولات اور مشروبات سے تواضع کرتے مگر خود ان کی غذا عموماً جَو کی روٹی اور ساگ اور ترکاریوں پر مشتمل ہوتی انھوں نے گدیلے بستروں کے بجائے عام قسم کی چارپائی کو اپنا بستر بنالیا تھا۔ کئی برس تک تو وہ زمین پر سوتے تھے اور بستر کی جگہ چٹائی ہوتی ی۔

ایک زمانے میں تو انھوں نے اپنی ریاست حکومت کو واپس کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ حتیٰ کہ اس سلسلے میں گورنر جنرل سے رابطے بھی ر لیے تھے مگر عین وقت پر جناح صاحب کی مداخلت کہ وجہ سے وہ اپنی اس شدید خواہش پر عمل نہیں کر سکے تھے۔ جناح صاحب نے انھیں مجھایا کہ اگرچہ ان کو دولت اور امارت سے کوئی لگاؤ نہیں، تاہم اگر محمود آباد اسٹیٹ کا وجود ختم ہوگیا تو وہ سارے ادارے جو عوام کی بہبود اور دمت کے لیے کام کرتے ہیں محمود آباد اسٹیٹ سے ملنے والی مالی امداد سے محروم ہو جائیں گے۔ ایک بار اسٹیٹ ختم ہوگئی تو اس کو دوبارہ قائم یں کیا جا سکے گا۔

یہ وہ پس منظر تھا جس کے پیشِ نظر جب جناح صاحب نے بّرِ صغیر کی آزادی کی جدوجہد میں راجا صاحب کی شمولیت کی خواہش کی ی اور انھوں نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اپنی تمام جائیداد مسلم لیگ کے اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے جناح صاحب کے حوالے کرنے کا صلہ کرلیا تھا۔ ان کے اس عمل پر صوبائی گورنر کو طیش آگیا اور اس نے راجا صاحب کو فوراً طلب کرلیا۔ اپنے اختیارات کے نشے میں گورنر نے ہزادے کو دھمکی دی کہ سیاست میں ان کی عملی شمولیت کی بنا پر وہ اپنی موروثی جائیداد سے محروم ہو سکتے ہیں اوہ یہ بھی کہ انھیں فوراً برطانوی ج کے سب سے بڑے دشمن جناح سے علیٰحدگی اختیار کر لینی چاہیے۔ نتائج سے بے خبر، راجا صاحب نے گورنر کا حکم بجالانے سے انکار کر یا۔ انھوں نے صاف الفاظ میں گورنر کو بتا دیا کہ وہ جناح صاحب سے وعدہ کر چکے ہیں اور اب ان کے لیے پیچھے ہٹنا ممکن نہیں۔"

دسمبر ۱۹۴۳ء کی تیسری تاریخ راجا صاحب کے لیے بہت خاص دن تھا۔ ان کی بیوی نے اولادِ نرینہ کو جنم دیا تھا جو ان کا ولی عہد تھا۔ ریاست کی روایات اور رسوم کے مطابق یہ واقعہ بڑے دھوم دھام سے منایا گیا۔ راجا صاحب خود بھی بے انتہا خوش تھے اور مجبوراً انھوں نے ں بڑے موقعے کو منانے کا فیصلہ کرلیا مگر ایک غیر روایتی انداز میں۔ مشرقی روایات میں بیٹے کو آنکھوں کی روشنی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اردو بان میں بیٹے کو 'نورِعین' کہا جاتا ہے۔ راجا صاحب نے اپنی کوششوں سے رعایا میں سے بہت سے لوگوں کو اکٹھا کیا جو کسی وجہ سے آنکھوں کی وشنی سے محروم ہو چکے تھے اور علاج کے اخراجات کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ دو مشہور سرجن اور آنکھوں کے علاج کے ماہر بلوائے گئے ھوں نے ان افراد کی جراحی کی۔ سارے اخراجات جن میں رہنا کھانا اور دوائیں وغیرہ شامل تھیں، راجا صاحب نے اپنے ذاتی جیب سے ا کیے۔ ولی عہد کی ولادت پر خدائے بزرگ و برتر کا شکر ادا کرنے کا یہ ان کا اپنا انداز تھا۔"

جو کچھ راجا صاحب کے پاس تھا، تیسرے عشرے میں مسلم لیگ کے احیا سے پاکستان کی تخلیق تک، انھوں نے سب کچھ خرچ کر دیا۔ نئی مملکت کے قیام کے بعد اقتدار کی طلب میں بھاگنے والوں میں راجا صاحب شریک نہیں ہوئے۔ پاکستان کے قیام میں اپنا کردار ادا کرنے کے بعد ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کی ہمت افزائی کے لیے جنھوں نے پاکستان کے حصول میں بے غرض خدمات انجام دی تھیں، انھوں نے ہندوستان ہی میں قیام کا فیصلہ کر لیا۔ مگر فرقہ پرست طبقے کے لیے ہندوستان میں ان کی موجودگی نا قابلِ برداشت تھی اس لیے کہ وہ ان کو اپنا سب سے بڑا دشمن تصور کرتے تھے۔ ملکی حالات سے دل برداشتہ ہو کر انھوں نے عراق جانے کا فیصلہ کر لیا۔ کئی برس تک وہ بغداد میں قیام پذیر رہے۔ وہاں قیام کے دوران انھوں نے تعلیم پر توجہ دی۔ اگر چہ ان کے شناساؤں کا حلقہ بہت وسیع تھا اور قریبی دوستوں میں ان کو ایک ممتاز عالم، سیاست داں اور بغداد کی معروف شخصیت تصور کیا جاتا تھا راجا صاحب نے اپنی مصروفیات ایک بہت ہی محدود حلقے تک محدود رکھیں۔ وہ عالموں کے حلقے میں آزادانہ فعّال رہے اور تعلیمی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے مگر انھوں نے سیاست دانوں سے دوری قائم رکھی۔ بالآخر وہ نیک ساعت آ ہی گئی جب اپنے ساتھیوں اور خیر خواہوں کے شدید اصرار پر انھوں نے ایک پاکستانی کی حیثیت سے کراچی میں قیام کا فیصلہ کر لیا۔ انھوں نے سیاست میں حصہ نہیں لیا مگر اپنے دوستوں اور مداحوں کو مشورے دیتے رہے جو ایک بڑی مایوسی کی بات تھی۔ انھوں نے نئی مملکت پاکستان کو بڑی خستہ حالت میں پایا۔ قائد نے اپنی پیروؤں اور قوم سے جو وعدے کیے تھے حالات اس کے بالکل برعکس تھے۔

راجا صاحب ایک ایمان دار اور وطن پرست رہنما تھے جن کا اپنا کوئی مفاد نہیں تھا۔ وہ اس بے ہودگی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے اور نہ ایک خاموش تماشائی رہ سکتے تھے۔ انھوں نے ایک بڑا قدم اٹھایا، بے خوف و خطر قائد کے پیغام کو پھیلانے اور یہ بتانے کا عزم کر لیا کہ قائد اس مملکت کے معاملات کو کس طرح چلانا چاہتے تھے۔

حالات تیزی سے اور اپنی بنیاد میں بدلنے لگے اور پاکستان میں امیر احمد خان کا قیام مشکل بنا دیا گیا۔ ان کے لیے سوائے پاکستان چھوڑ دینے کے کوئی اور راستہ نہیں رہ گیا تھا۔ وہ انگلستان چلے گئے، اسی ملک میں جس کے خلاف وہ برسوں اپنے ملک کی آزادی کے لیے تن من دھن سے لڑتے رہے تھے۔ انھیں اس بات کا کبھی خیال بھی نہیں آیا ہوگا کہ ایک دن عمر کے اس نازک دور میں وہ برطانیہ کے رحم و کرم ہوں گے۔

ہندوستان کی اشرافیہ کے ایک معزز خاندان کا پیدا، جس کی پرورش محمود آباد کے مخملیں فرش والے محلوں، قیصر باغ اور لکھنؤ کے بٹلر محل میں ہوئی تھی اب پناہ کا طلب گار تھا۔ لندن شاید ان کے لیے فراخ دل تھا، کہ وہاں نہ صرف ان کو پناہ مل گئی بلکہ ان کو اپنی بقیہ زندگی گزارنے کے باعزت اسباب بھی فراہم ہو گئے۔ امیر احمد خان اپنے حالات پر بالکل فکر مند نہیں تھے۔ اس کے برعکس وہ اس بات پر مطمئن تھے کہ لاکھوں پناہ گزینوں کے مقابلے میں ان کے حالات بہت بہتر تھے۔ لندن کے اسلامی مرکز نے انھیں ملازمت کی پیش کش کی، جس کے ذریعے وہ اپنی سادہ بود و باش کو قائم رکھ سکے۔''

جب سے میں روشن علی بھیم جی کی وساطت سے اس انسان سے واقف ہوا، اس کی آنکھوں کی اداسی نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ میرے ذہن میں جوں ہی اس کا خیال آتا ہے، فوراً اس کی اداسی کا منظر میری آنکھوں میں پھرنے لگتا ہے۔ جب میں اور میرے دوست (روشن علی بھیم جی) اس کتاب کے خاکے کے بارے میں مشاورت کر رہے تھے، ہم نے فوراً یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اس میں اس عظیم انسان کا خاکہ شامل کیا جائے حالاں کہ راجا صاحب کا ایسٹرن فیڈرل انشورنس کمپنی سے، بورڈ کے ڈائریکٹر کی یا کسی اور حیثیت میں، براہِ راست کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ جناب کے ایف حیدر اور اصفہانی خاندان سے گفتگو کے ذریعے میں یہ جانتا تھا کہ راجا صاحب اس ادارے کی حمایت کرتے تھے اور سنِ بلوغت پر پہنچنے کے بعد ان کے پاس اس کمپنی کے حصص بھی رہے تھے۔ میرے علم کے مطابق اصفہانی خاندان نے راجا

صاحب کو اس کمپنی کا ڈائریکٹر بننے کی پیش کش کی تھی، یہی خواہش خلیلی اور بھیم جی نے بھی کی تھی جب کمپنی کی انتظامیہ ان کے پاس آئی تھی۔ گرچہ راجا صاحب نے اس تجویز کو کبھی مکمل طور پر رد نہیں کیا تھا، ان کا خیال تھا کہ چوں کہ وہ حقیقتاً کاروبار کے آدمی نہیں تھے اس لیے وہ کمپنی کی بھلائی کے لیے کچھ نہیں کر سکیں گے۔ اس کے باوجود وہ اخلاقی طور پر اس قومی ادارے کی حمایت کرتے تھے کہ یہ ان کے بہت سے دوستوں سے بہت قریب تھا۔

روشن علی بھیم جی نے مجھ سے کئی بار راجا صاحب سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر کیا تھا اور میں نے ہر بار ان سے یہی سوال کیا تھا کہ پاکستان کی تخلیق کا ہدف حاصل کر لینے کے بعد آخر راجا صاحب نے سیاست سے عملی طور پر دور رہنے کا فیصلہ کیوں کیا؟ اس کے بہت قسم کے جوابات دیے گئے مگر کسی جواب نے مجھے پوری طرح مطمئن نہیں کیا۔ اور شاید اس سوال کا کوئی جواب تھا ہی نہیں۔ اس نکتے پر راجا صاحب کے سوانح نگار نے بھی زور دیا ہے کہ وہ پیدائشی سیاست داں نہیں تھے۔ ان کے چاہنے والے اور پیروکار اس بات پر حیران ہوں گے اور شاید یقین بھی نہ کریں۔ ''فطرتاً وہ سیاست داں نہیں تھے، اس لیے کہ سیاست میں دوسرے گروہوں اور پارٹیوں کی مخالفت کرنی ہوتی ہے اور راجا صاحب کا مہربان مزاج کسی کو تکلیف پہنچانے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ آزادی کے بعد، ان کی تجربہ کار آنکھوں نے دیکھ لیا ہوگا کہ کسی سیاسی ادارے میں شمولیت ان کے لیے مبنی بر عقل نہ ہوگی۔ محاذ آرائی سے بچنے کا یہی طریقہ تھا۔'' میں سید اشتیاق حسین سے کلی طور پر اتفاق کروں گا۔ وہ پاکستان جسے راجا صاحب نے اس وقت دیکھا، جب وہ یہاں رہنے کی غرض سے آئے تھے، اس پاکستان سے بہت مختلف تھا جس کی انھوں نے تمنا اور جس کے لیے جد و جہد کی تھی۔ جس نیک مقصد کے لیے انھوں نے اپنا سب کچھ لٹا دیا تھا، وہاں کے لوگ لوٹ مار میں مصروف تھے، طاقت کے لیے دست و گریباں ہو رہے تھے۔

راجا صاحب نے خود اپنی سوانح حیات کبھی نہیں لکھی۔ مگر کچھ یادداشتیں انھوں نے لکھ رکھی تھیں جنھیں حسین صاحب ترتیب دے کر نظرِ عام پر لا رہے ہیں۔ یہ بہت طویل نہیں، صرف چند صفحات پر مشتمل ہیں۔ میں نے 'یادداشتوں' کے یہ چند صفحات پڑھے ہیں، اور احتیاط سے بار بار پڑھے ہیں۔ پہلا ہی جملہ ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے۔ ''ہندوستان کی قومی آزادی کی تحریکوں میں میری شمولیت ذاتی شمولیت ہے اور عمر بھر کی ہے۔'' اور چند صفحات کے بعد ٹالسٹائی کے تصورات ملتے جلتے رجحانات کے اعتراف کے ساتھ وہ ان باتوں کا خلاصہ پیش کرتے ہیں جو ان کو اس مقام تک لے آئے ہیں کہ 'اصول پڑھے لکھے رئیسوں کی اجارہ داری نہیں ہوتے، وقار اور دل رُبائی کے جذبے دل سے نکلتے ہیں، رقص کی تعلیم دینے والے کی کوششوں سے نہیں۔''

میں نے کچھ لوگوں کو راجا صاحب کا تقابل شہزادہ 'سدھارتھ' سے کرتے سنا ہے جس نے سچ اور ابدی سکون کی تلاش کی خاطر اپنی سلطنت، اپنے محلات، خوب صورت بیوی اور نوزائیدہ بیٹے کو تج دیا تھا۔ حسین صاحب نے اپنی کتاب میں اس تقابل کی طرف اشارے کیے ہیں اور مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ مگر مجھے زیادہ خوشی راجا صاحب کے اس جواب سے ہوئی جو اس تقابل کے سلسلے میں انھوں نے دیا تھا۔ حسین صاحب نے اپنی کتاب میں اس کو نقل کیا ہے جو یہ تھا، ''ان دونوں کے درمیان بنیادی فرق یہ تھا کہ راجا ترکِ تعلق کے نظریے سے متفق نہیں تھا۔ (اس کے نزدیک) کلیسا اور ریاست، روح اور مادہ، ابتدا سے ایک دوسرے سے ہم رشتہ تھے۔ کسی اور روحانی دور افتادہ دنیا کے حصول کے لیے انسان کو اپنی دنیا سے ترکِ تعلق نہیں کرنا چاہیے، وہ دنیا کا ایک اچھا باشندہ بن کر بھی مسلمان رہ سکتا ہے۔''

میں اس بات کا قائل ہوں کہ وہ اچھے مسلمان بھی تھے اور دنیا کے اچھے باشندے بھی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ملک جس کی تخلیق میں انھوں نے مدد کی تھی وہی ان کی قبل از موت کا باعث ہوا۔ ڈھاکا کا زوال اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی نے اس شخص کو شدید دکھ پہنچایا جس نے اپنا سب کچھ پاکستان کی تخلیق کے سلسلے میں قربان کر دیا تھا۔ یہ ضرب راجا صاحب محمود آباد کے لیے موت کا پیغام بنی اور ڈھاکا کے زوال کے فوراً بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

راجا صاحب کا جسدِ خاکی ایران روانہ کر دیا گیا جہاں مشہد کے مشہور قبرستان 'باغِ رضواں' میں اس کی تدفین ہوئی۔ کچھ عرصے بعد اس قبرستان کو باغ میں تبدیل کر دیا گیا۔ کئی سماجی، تہذیبی، مذہبی انجمنوں اور با اثر شخصیتوں، جس میں راجا صاحب کے قریبی ساتھی اصفہانی کی درخواست شامل تھی، حکومتِ ایران کی ایما پر راجا صاحب کا جسدِ خاکی امام (علی رضا) کے مزار کے احاطے میں دوبارہ دفن کر دیا گیا۔ اس کا سارا انتظام مملکتِ ایران کے حاکمِ اعلیٰ نے براہِ راست کیا تھا اور انھی نے جیبِ خاص سے سارے اخراجات ادا کیے گئے تھے۔

راجا صاحب مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے تحریکِ پاکستان کی ایک اور شہ زور شخصیت ایم اے ایچ اصفہانی نے ایک جملے کے کوزے میں اپنے خیالات کا دریا بند کر دیا، ''انھوں نے مسلمانوں کے مفاد میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا اور اس کے عوض کسی شے کی توقع نہیں کی۔''

دواچھے دوست عبدالغنی حاجی حبیب اور روشن علی بھیم جی

ای ایف یو کے دوسابقہ چیئرمین عبدالغنی حاجی حبیب اور مرزا احمد اصفہانی ۱۹۶۷ء کے ڈھاکا کنونشن میں
گورنر منعم خان کا استقبال کررہے ہیں

اراگ خاندان

مشکل وقت کا ساتھی

چالیس برس قبل جب روشن علی بھیم جی نے ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی کا انتظام سنبھالنے کا ارادہ کیا تھا تو اس بنا پر کہ وہ کم ازکم تین باتوں پر قطعی بھروسا کر سکتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ وہ اس شخص کی حمایت پر پورا اعتماد کر سکتے تھے جس نے ان کو اس 'خودکُش' مہم کے لیے راضی کرلیا تھا اور وہ عباس خلیلی کی ذات تھی، جو کمپنی کے چیئرمین کا عہدہ سنبھالنے والے تھے، اور جو ان کو اپنی اور کئی سرکاری افسران کی ایما پر لے آئے تھے۔ دوسرے یہ کہ انھیں اپنی تصوراتی طاقت، غیر متزلزل ارادوں اور خود اعتمادی پر پورا یقین تھا۔ تیسرے وہ اپنے باپ جیسے دوست حاجی حبیب حاجی پیر محمد اور ان کے اہلِ خاندان کی بے غرض اور غیر مشروط امداد پر بھروسا کر سکتے تھے۔

وہ تھے حاجی حبیب پیر محمد، ذات کے میمن، جو حاجی حبیب سیٹھ کے نام سے موسوم تھے جو اپنے اور دوسرے حلقوں میں بھی احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کے والد اوسط درجے کے کاشتکار تھے جو ایک چھوٹے سے آبائی قطعۂ آراضی پر گنے کی کاشت کیا کرتے تھے۔ اس فصل سے وہ کچی شکر (brown sugar) بنا کر منڈیوں میں فروخت کیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس کو اپنی زندگی بھر کا پیشہ نہیں سمجھتے تھے اس لیے انھوں نے بمبئی کے ایک بڑے تجارتی ادارے میں کلرک کی ملازمت قبول کر لی۔ یہی وہ تجربہ تھا جس نے ان میں بہت کچھ کرنے کی 'بھوک' کو جنم دیا اور انھوں نے اپنی تقدیر کو اپنے ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کر لیا۔ لہٰذا وہ اور ان کے بیٹے سیلون (حال سری لنکا) کے لیے عازمِ سفر ہوئے، انھوں نے وہاں چار برس تک قیام کیا اور برما سے چاول درآمد کر کے سیلون کی منڈیوں میں فروخت کرتے رہے۔ جب کچھ دولت جمع ہوگئی تو انھوں نے کلکتے جانے اور وہاں بنیادی طور پر ہر قسم کی اشیائے خوردونوش کے تاجر کی حیثیت سے کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوئے اور بہت جلد ہی سارے ہندوستان میں ان کے ادارے کی شاخیں قائم ہوگئیں۔

مسٹر بھیم جی ان کے بیٹے، حاجی حبیب اور ان کے خاندان سے اس وقت سے واقف تھے جب وہ حاجی حبیب سیٹھ کے کاروبار کے بیمے کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔

ان کے باپ سمان دوست کا گھرانا کافی بڑا تھا، بارہ بچے تھے جن میں سات بیٹے اور پانچ بیٹیاں تھیں۔ ان میں سے تین خاندان کے کاروبار میں شامل تھے، 'عبدل'، 'احمد' اور 'رحمٰن'۔ میں ان تینوں سے واقف تھا۔ رحمٰن جنھیں پیار سے 'مٹھو' پکارا جاتا تھا، اب تک بقیدِ حیات اور عملی طور پر ای ایف یو کے ڈائریکٹر ہیں۔

مٹھو سیٹھ کہتے ہیں ''والد صاحب بمبئی کے میمنوں کی جماعت کے سب سے معتبر 'بزرگ' سمجھے جاتے تھے۔ اس قدر کہ تقسیم سے قبل، ۱۹۴۷ء کے گرمی کے موسم میں، جب محمد علی جناح نے آدمجی سیٹھ (سر آدمجی حاجی داؤد) سے رجوع کیا تا کہ وہ اپنی جماعت والوں کو نئی تشکیل شدہ مملکت پاکستان کی ترقی کی خاطر وہاں جا کر کاروبار کرنے کی ترغیب دیں، تو آدمجی سیٹھ نے ان سے کہا کہ وہ معروف اور با اثر

شخصیت مسلم لیگی، سرعبداللہ ہارون کے بیٹے یوسف ہارون کو حاجی حبیب سیٹھ کے پاس بھیجیں۔''

ایسا ہی کیا گیا۔ جناب یوسف ہارون حاجی حبیب سیٹھ کے آبائی شہر 'بانٹوا' گئے اور دونوں کے درمیان طویل مذاکرات کے بعد حاجی حبیب سیٹھ نے مشورہ دیا کہ جماعت کے تمام اہم کاروباری حضرات کو دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا جائے اور جناح صاحب کی ذاتی درخواست اور اس کے عوامل سے آگاہ کیا جائے۔

میری ملاقات کے دوران منّھو سیٹھ نے بتایا کہ؟''اس طرح سب کچھ ہوگیا۔ اسی وقت یہ فیصلہ کرلیا گیا کہ ہم سب پاکستان ہجرت کریں گے۔ اس طرح ہم لوگ یہاں آ گئے۔ یہ نومبر ۱۹۴۷ کا واقعہ ہے، تقسیم سے صرف دو ماہ بعد کا، اور ہم لوگ کراچی میں آباد ہو گئے۔ ہمیں جلدی کرنی پڑی اس لیے کہ ہمارے خاندان کے تمام فلیٹ بھارتی فوجیوں کے ہاتھوں لوٹے گئے، مگر کوئی جانی نقصان نہیں ہوا تھا۔ میرے والد نے یہاں آ کے نئے سرے سے اپنا کاروبار شروع کیا، اس کی توسیع ہوئی اور نیا نام ARAG Limited رکھا گیا۔ اس کے بعد ۱۹۵۸ء میں حبیب ٹیکسٹائل ملز کے علاوہ اور دوسرے کاروبار شروع کیے گئے، جن میں سے کچھ بڑی نوعیت کے مشرقی پاکستان میں تھے۔

ہم روشن علی بھیم جی سے اچھی طرح واقف تھے مگر میرے بڑے بھائی عبدل اور میرے والد ان کو سب سے زیادہ جانتے تھے۔ کہ وہ بمبئی میں ہمارے کاروبار کے بیمے کی دیکھ بھال کرتے تھے اور یہاں کراچی میں بھی یہ فرض انھیں کو اس وقت سونپا گیا جب انھوں نے 'پاک انڈر رائٹرز' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا۔ میرے والد ان کو اپنا بیٹا سمجھتے تھے، بالکل ہم میں سے ایک کی طرح۔ کچھ باتوں میں تو وہ بیٹوں سے بھی زیادہ قریب تھے۔ مثال کے طور پر جب میرے والد پاکستان سے باہر جاتے، ہم میں سے کوئی نہیں مگر، روشن ہمیشہ ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ اور پھر ایک دن جناب عباس خلیلی اور روشن دونوں ساتھ آئے اور میرے والد سے ایسٹرن فیڈرل یونین کے بارے میں بات چیت کی جس کے اکثریتی حصص ان دنوں اصفہانی خاندان کی ملکیت تھے۔ انھوں نے میرے والد سے کہا کہ اس ادارے کے لیے کچھ کرنا پڑے گا اور یہ بھی کہ اصفہانی خاندان کو اس کے حصص کسی اور کے حوالے کرنے ہوں گے۔ تو کیا یہ ARAG اور ای ایف یو کے لیے بہتر نہ ہوگا کہ ARAG اپنے قدم آگے بڑھانے کا فیصلہ کرے؟

میرے والد ہمیشہ سے روشن پر پورا بھروسا کرتے تھے اور انھیں علم تھا کہ ان کے بیٹوں میں سے کوئی بھی اس بیمہ کمپنی کو نہیں چلا سکتا تھا۔ مگر چوں کہ وہ روشن کو اپنے بیٹوں کی طرح سمجھتے تھے اس لیے یہ ان کا خاندانی مسئلہ بن گیا تھا اور انھوں نے تجویز کو قبول کرلیا۔ یہ ایک مشکل فیصلہ تھا اس لیے کہ، جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، ہم میں سے کسی کو بھی بیمے کے کاروبار کا ادراک نہیں تھا۔ مگر ہم سب کو روشن پر پورا اعتماد تھا۔ ان کو، جس طرح وہ چاہیں، ای ایف یو چلانے کے تمام اختیارات سونپ دیے گئے اور عبدل بھائی اس کے چیئرمین بنا دیے گئے۔ اگر چہ انھوں نے کبھی کسی معاملے میں مداخلت نہیں کی۔ خاندان میں سے کسی نے بھی کبھی ایسا نہیں کیا اور اس طرح ای ایف یو ہمارے خاندانی ادارے ARAG کا حصہ بن گئی۔ مگر ہم سب اہل خاندان اس کو بنیادی طور پر سرمایہ داری کا معاملہ سمجھتے تھے۔ روشن کے لیے یہ مختلف معاملہ تھا۔ وہ بیمہ اور بالخصوص زندگی کے بیمے کو اپنی زندگی کی مہم سمجھتے تھے، اور وہ پاکستان کی سب سے پرانی اور سب سے بڑی بیمہ کمپنی کو بچانا چاہتے تھے، جس کو تجارتی ادارے کی طرح نہیں بلکہ ایک تنظیم کی طرح چلا رہے تھے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جب ہم لوگوں نے ای ایف یو میں سرمایہ کاری کا ارادہ کیا تھا تو ذاتی طور پر میں اس کے بارے میں زیادہ پُر جوش نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ ای ایف یو کی مالی مشکلات کے پیشِ نظر اس سرمایہ کاری میں خطرات تھے۔ مگر روشن پر ہمیں بڑا اعتماد تھا اور جب وہ لندن اور میونخ سے واپس آئے تو ہمیں احساس ہو گیا تھا کہ میونخ ری کی معیت میں ای ایف یو مشکلات کے طوفان سے بچ نکلے گی۔ ہمیں خوشی بھی تھی بلکہ ایک طرح کا فخر بھی محسوس ہو رہا تھا کہ ہم نے روشن کو بڑی مشکل سے نکلنے میں مدد فراہم کی ہے۔ اور اس موقعے پر بہت سے لوگوں کی خواہش تھی کہ ہم کمپنی کے حصص کو انھیں فروخت کر دیں۔ اس وقت ہمارے لیے اچھا خاصا منافع کمانے کا موقع تھا۔ اگر چہ روشن اور عبدل بھائی نے مجھے پورا اختیار دے دیا تھا کہ میں جب

چاہوں اور جسے چاہوں اپنے حصص فروخت کر سکتا ہوں مگر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ ہمارے مفاد کے خلاف ہوگا۔ ہمیں اس ادارے کو چلانا چاہیے اور روشن ہی اس کو صحیح طرح چلا سکتے ہیں۔ ہمارے خاندان کے لیے میونخ ری کی ساجھے داری اس مشکل سے نکلنے کی بہترین راہ تھی۔ ہم اس وقت قائل ہو گئے تھے کہ تینوں ساجھے دار، میونخ ری، روشن اور ARAG، مل کر اس کو ایک کامیاب داستان میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ تاریخ نے ثابت کر دیا کہ ہم لوگ صحیح راہ پر تھے، اور بھٹکے نہیں۔''

اس طرح حبیب خانوادہ اور اس کا ادارہ ARAG Ltd ایسٹرن فیڈرل یونین کا اکثریتی حصے دار بن گیا اور روشن علی بھیم جی اپنے دوستوں کی مدد سے ملک کے سب سے بڑے بیمے کے ادارے کو بچانے میں کامیاب ہو گئے۔

بھیم جی کے دوست کے سب سے بڑے بیٹے عبدالغنی حبیب، کمپنی کے چیئر مین بن گئے۔ مگر جیسا کی ان کے بھائی متّھو نے کہا ہے، برائے نام سربراہ تھے اور انھوں نے کبھی کمپنی کے پیشہ ورانہ انتظام میں دخل اندازی نہیں کی۔ انھوں نے سب کچھ روشن پر چھوڑ دیا تھا اور حبیب خاندان کے دوسرے افراد کی طرح وہ بھی روشن کو اس خاندان کا فرد سمجھتے تھے۔

ای ایف یو میں اپنے قیام کے دوران میں عبدل بھائی سے اچھی طرح واقف ہو گیا تھا۔ اس کے بعد بھی میری ان سے لندن میں کئی بار ملاقات ہوئی مگر ہمیشہ روشن علی بھیم جی اور متّھو کے ساتھ۔ میں نے کمپنی کی ایسی کئی میٹنگ میں شرکت کی تھی جب عبدل بھائی چیئر مین کی کرسی پر ہوتے تھے۔ مگر وہ ایسے نہیں تھے کہ اپنی موجودگی، بیمے کے تکنیکی اور مالیاتی معاملات کے علم کے باعث میٹنگ پر حاوی ہو جاتے۔ انھوں نے کبھی یہ عندیہ بھی نہیں دیا کہ وہ حاوی ہو سکتے ہیں۔ وہ تو ایسے انسان تھے جن کی سنجیدگی اور راست بازی ڈھکی چھپی نہیں ہوتی تھی، اس قدر کہ میٹنگ کے دوسرے شرکا کبھی ان کو غلط راستے پر ڈالنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ عام اور بڑے مجمعے میں وہ ایک شرمیلے انسان لگتے تھے مگر قریبی دوستوں کی نجی محفلوں میں وہ ملنسار بلکہ باتونی لگتے تھے۔ وہ بہت نرم دل انسان تھے اور اپنی زندگی میں انھوں نے بہت سے لوگوں کی فراخ دلی سے امداد کی تھی۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ 'بانٹوا' میں جہاں سے حبیب خانوادے کا تعلق تھا، لوگ عبدل بھائی کو 'شہزادہ سیٹھ' کہتے تھے۔ انھوں نے اپنی جماعت کے اتنے لوگوں کی امداد کی ہے، بیواؤں، یتیموں اور دوسرے ضرورت مندوں کی کہ لوگ آج بھی ان کو بڑے احترام سے یاد کرتے ہیں۔

متّھو نے مجھے ایک واقعہ سنایا تھا جس کی بنا پر عبدالغنی کو 'عبدل سیٹھ' کہا جانے لگا تھا۔ ''ہمارا خاندانی معالج عبدل بھائی اور روشن کے ساتھ اپنی سالانہ تفریح کے لیے یورپ گیا ہوا تھا۔ مجھے کسی ڈاکٹر کی ضرورت ہوئی تو میں نے ARAG کے اکاؤنٹنٹ قاسم سے پوچھا کہ وہ کسی ڈاکٹر کو جانتا ہے جو بھروسے کا اور اچھا ہو۔ اس نے جوڑیا بازار کے ایک ڈاکٹر کا نام پیش کیا۔ جب میں نے پوچھا کہ صرف یہی ڈاکٹر کیوں تو وہ بولا کہ آپ خود جا کر دیکھ لیجیے۔ اور جب میں نے اس ڈاکٹر سے رابطہ کیا تو اس نے مجھے اپنی مطب آنے سے منع کیا اور کہا کہ میں جہاں بھی ہوں وہ فوراً وہاں پہنچ جائے گا۔ جب میری اس سے ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا کہ اس نے مجھے اپنے مطب آنے سے کیوں منع کیا تھا اور اس نے خود میرے پاس آنے کی زحمت کیوں گوارا کی۔ اس نے اپنی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ شخص جو اس وقت آپ کے سامنے ہے، ہائی اسکول سے میڈیکل کالج تک، صرف عبدل بھائی ہی کی وجہ سے پہنچا تھا۔ مجھے یہ سن کر بہت حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی کہ اتنے برس تک وہ اس کی مدد کرتے رہے اور ہم میں سے کسی کو بھنک تک نہیں پڑنے دی۔ مگر مجھے تو معلوم ہونا چاہیے تھا کہ میرا بھائی ایسا تھا، جو، جتنی جلد ہو سکے اور جہاں تک ممکن ہو، لوگوں کی مدد کرتا تھا۔ وہ میں ہوں، میرے بھائی احمد، روشن، ڈاکٹر خان، وحید آدمجی، صدری اصفہانی یا حاکم علی ہوں، جب بھی ہماری کوئی ضرورت ہوتی، مالی یا ذہنی، ہم سب ہمیشہ انھی سے رجوع کرتے تھے اور وہ ہمیشہ مدد کے لیے تیار ہوتے، اور ہمیشہ کوئی حل ڈھونڈ نکالتے۔''

عبدالغنی مارچ ۱۹۸۰ء میں اور نسبتاً کم عمری میں انتقال کر گئے۔ اس وقت وہ صرف تریسٹھ برس کے تھے۔ اپنے بھائی احمد جو

ای ایف یو بورڈ میں ڈائریکٹر تھے، ان کے ایک برس بعد چل بسے۔ ان دونوں کا انتقال خاندان کے لیے اور کاروبار کے لیے بڑا مہیب نقصان تھا جو ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے سبب اپنے کاروبار کا ایک بڑا حصہ گنوا چکا تھا۔

یہی وہ وقت تھا جب انھیں (اپنے خاندان کو) ای ایف یو کے حصص کا ایک بڑا حصہ فروخت کرنا پڑ گیا تھا۔ مگر عبدالرحمٰن حاجی حبیب، مٹھو اپنے بھائیوں کی جگہ ۱۹۸۱ء میں ڈائریکٹر بنے اور ابھی تک ہیں۔ کمپنی میں ان کو ایک مستقل دفتر مہیا کیا گیا ہے۔ کاروباری افراد اور تاجروں سے ان کے بڑے مضبوط روابط ہیں اور ان کو اکثر کمپنی کے لیے ان روابط کو استعمال کرنے کے لیے کہا جاتا ہے۔

مٹھو شہر کی ایک جانی پہچانی سماجی شخصیت ہیں۔ ان کا کہا ہوا اور ان کے رسوخ آج بھی اہم ہوتے ہیں باوجودیکہ مشرقی پاکستان کے سانحے میں ان کے خاندان نے سب سے زیادہ نقصان اٹھایا ہے۔ کراچی جم خانہ ہو یا سندھ کلب ان کا نام سب جانتے ہیں اور وہ لوگ جو کلب میں اثر رکھتے ہیں یا اس کی صدارات یا کمیٹی کی رُکنیت کے خواہاں ہوتے ہیں، مٹھو کی مدد چاہتے ہیں۔

کراچی چیمبر آف ٹریڈ کی حیثیت سے وہ شہر کے کاروباری حلقے کی ایک معروف شخصیت تھے۔ میں معاشیاتی اور سیاسی مسائل پر ان سے گفتگو کر کے لطف لیتا رہا ہوں۔ اس لیے کہ ان مسائل پر ان کے خیالات درسی نہیں بلکہ عملی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ انھیں اور ان کے 'حبیب' خاندان کو ماضی کے ذاتی نقصانات اور قربانیوں کا خوب تجربہ ہے۔ اس لیے کہ یہ لوگ قائدِ اعظم کے بلاوے پر ہندوستان سے ہجرت اور مشرقی پاکستان کی علٰحدگی میں بہت کچھ کھو چکے ہیں۔

مجھے ان کی ایک بڑی دل چسپ گفتگو اچھی طرح یاد ہے جس میں انھوں نے بتایا تھا کہ ان لوگوں نے جو غیر منقسم ہندوستان میں مستحکم حیثیت میں رہ رہے تھے جناح کے کہنے پر پاکستان ہجرت کی تھی۔ انھوں نے کہا، ''یہ ایک بڑا سوال ہے، اور میرے لیے مشکل بھی۔ کسی کے لیے بھی مجھ جیسے، اور میرے خاندانی پس منظر کے آدمی سے اس پر گفتگو کرنا آسان نہ ہوگا۔ مادّی نقطۂ نگاہ سے ہم جیسے لوگوں کو پاکستان کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔ پاکستان ہمارے لیے ضروری نہیں تھا۔ ہندوستان میں ہم سکون سے آباد تھے اور آرام دہ ترین احوال اور پُرسکون اطراف میں رہتے تھے۔ ہمارا ادارہ ہر اعتبار سے محفوظ و مامون تھا۔ صرف برصغیر میں ہماری ۶۷ر اور ملک سے باہر ۱۷ر شاخیں کام کر رہی تھیں۔ تو پھر کسی کو پاکستان جیسے ملک کی کیا ضرورت ہوگی، جو اس ملک کے مقابلے میں جہاں ہم کاروبار کر رہے تھے، ایک چھوٹا سا ملک تھا؟ جس خطے کو پاکستان بننا تھا وہاں ہماری ایک چھوٹی سے شاخ، کراچی میں تھی۔ وہاں مشکل سے کوئی کاروبار تھا۔ پنجاب کے بیوپاری بھی کراچی کے مقابلے میں کلکتے، بمبئی، کانپور اور مدراس سے کاروبار کرنا پسند کرتے تھے۔ اس لیے کہ کراچی کے رہنے والے، پاکستان بننے سے پہلے تجارت میں دل چسپی نہیں رکھتے تھے۔ وہ زمیندار، وڈیرے، سردار وغیرہ ہوتے تھے۔ ان کے ذہن کاروباری نہیں تھے۔ مگر جب پاکستان وجود میں آیا تو یہ ان لوگوں کے لیے سنہرا موقع تھا جن کا غیر منقسم ہندوستان میں کوئی کاروبار نہیں تھا، لہٰذا انھوں نے کاروبار جمانے کی کوشش کی۔ مگر ہمارے خاندان جیسے لوگوں کو بھلا کیا ضرورت تھی، ہندوستان اور دنیا بھر میں جن کے کاروبار تھے اور جو اپنا سب کچھ لٹا کر آئے تھے؟ اگر آنا ہی تھا تو خاندان کے آدھے لوگوں کو آنا چاہیے تھا، باقی وہیں رُک جاتے۔ مگر بدقسمتی سے چوں کہ بانٹوا میں لوٹ مار شروع ہوگئی تھی اس لیے پورے خاندان کو ہجرت کرنی پڑی تھی۔''

ان سب باتوں کے باوجود عبدالرحمٰن حاجی حبیب جیسے لوگوں نے ملک کے قیام کے بعد کے پہلے پچاس برسوں میں جو کچھ حاصل کیا ہے، اس پر فخر کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ اور ان کے خاندان والے اس کا کوئی صلہ نہیں چاہتے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے اہلِ خاندان کے کارناموں سے واقف ہیں۔ ایک دفعہ انھوں نے مجھ سے کہا، ''میرا خیال ہے کہ پاکستان کے قیام کے باعث اب یہاں رہنے والے مسلمانوں کو بہت فائدے حاصل ہوئے ہیں۔ اور ہندوستان سے ہجرت کرنے والے مسلمان غیر منقسم ہندوستان کے مقابلے میں زیادہ خوش حال ہیں۔ اگر ہم تمام کیفیات کا احاطہ کریں تو میں اس بات کا قائل ہوں کہ اس ملک میں ہم نے کافی ترقی کی ہے۔ ترقی ہوئی تو ہے مگر بیشتر

مادّی نوعیت کی۔ وہ لوگ جو گھوڑا گاڑی استعمال کرتے تھے وہ آج شہر میں ٹویوٹا اُڑائے پھرتے ہیں۔ اس میں کوئی قباحت نہیں اور میں اس کو بھی ترقی کہنے کے لیے تیار ہوں اگر ہم اپنے مشترکہ ماضی اور پرانی قدروں کو برقرار رہنے میں کامیاب ہو جاتے جو ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں، اپنے ہی سیاست دانوں کے ہاتھوں برباد ہو چکی ہیں۔ ان لوگوں نے کوئی ترقی نہیں کی ہے۔ کیا وجہ ہے کہ بازار کا عام آدمی ہمہ وقت ان طاقتوں کے ساتھ، اپنی حکومتوں کے ساتھ جنگ کی حالت میں ہے۔ اس لیے کہ دل کی گہرائیوں سے یہ ارباب اقتدار کو 'حاکم' سمجھتے ہیں، پرانے جاگیرداروں کی مانند، غیر ملکیوں کی طرح۔ ان کے ذہنوں میں کم از کم یہی ہے۔ جب اپنی حکومتوں کے بارے میں ہمارے دونوں ملکوں کے لوگ بات کرتے ہیں تو 'ہم' اور 'وہ' کیوں کہتے ہیں؟''

میں نے مٹھو یا حبیب خاندان کے کسی اور فرد کو اپنے نقصانات پر شکوہ کرتے نہیں سنا مگر سچ پوچھا جائے تو یہ بڑے دل گردے کی بات ہے کہ ہندوستان سے ہجرت کے وقت لٹنے کے بعد جو کچھ بنایا تھا وہ دوسری بار اس وقت لٹا، جب دسمبر ۱۹۷۰ء میں بنگلہ دیش بنا، اور زخموں پر نمک کے مانند، جب بھٹو نے ان لوگوں کی بیشتر صنعتوں کو قومی ملکیت میں لے لیا۔ میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے کہ پاکستان کی قوم نے کبھی ان لوگوں کی شکر گزاری نہیں کی، جن خاندانوں نے اپنے ملک کے لیے قربانیاں دی ہیں۔

دوستی کے لیے مٹھو لاجواب انسان ہیں۔ وہ بہت خیال رکھنے والے ہیں اور ہمیشہ مدد کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ان کے اور روشن علی بھیم جی کے درمیان پیدا ہونے والی ذاتی دوستی میں ان کی یہ خصوصیت اور بھی ابھر کر سامنے آئی ہے۔ جب وہ دونوں شہر میں ہوں تب شاید ہی ایسا کوئی دن گزرتا ہو جس میں ان دونوں کی ملاقات نہ ہو۔ اور ان دنوں جب کبھی مسٹر بھیم جی گھر سے نکلنے کے قابل نہیں ہوتے، تب بھی مٹھو اپنے دوست سے ملاقات اور گپ شپ کے لیے ضرور پہنچتے۔ مٹھو کہتے ہیں کہ روشن کتنے حیرت انگیز انسان ہیں۔ ان جیسا دوست مشکل سے ملتا ہے۔ انھوں نے میرے لیے بہت کچھ کیا ہے، مالی اعتبار سے ہی نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں انھوں نے میری مدد کی ہے اور میری رہنمائی کی ہے۔ اس دن سے جب میں نے ڈاڑھی مونڈنا شروع کیا ہے، انھوں نے مجھے ڈاڑھی مونڈنا بھی سکھایا ہے۔ ہماری ان کی بہت طویل اور حیرت انگیز دوستی ہے۔ انھوں نے ہر معاملے میں میرے مدد کی ہے، حتیٰ کہ میرے بچوں کی شادی میں بھی۔ اور بھلا میری بیوی نے پردہ کیسے چھوڑا۔ وہی تھے جنھوں نے یہ کام کیا۔ میں بے شمار طریقوں سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ حیرت انگیز انسان ہیں۔ اور 'اس دن' کے بعد میں ہمیشہ انھیں تلاش ہی کرتا رہوں گا۔''

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، حبیب خاندان نے ای ایف یو کے چیف ایگزیکٹو، چیئرمین اور اکثریتی حصص کے مالک، جناب روشن علی بھیم جی کی زندگی میں ویسا ہی اہم کردار ادا کیا ہے جیسا انھوں نے حبیب خاندان کے لیے کیا تھا۔

ای ایف یو کے اس دور کے ڈائریکٹر ایس ایم یوسف قمر ہاؤس کی ایک تقریب میں
روشن علی بھیم جی کے ساتھ

ایس ایم یوسف

ایک بے مثال سرکاری افسر

روشن علی بھیم جی نے ایسٹرن فیڈرل کے چیف ایگزیکٹیو کا عہدہ سنبھالنے کے بعد ایک طاقت ور اور نہایت بارسوخ بورڈ آف ڈائریکٹرز کی ضرورت کو محسوس کیا۔ لہٰذا انھوں نے ایسے لوگوں کی تلاش شروع کردی جو اپنی پیشہ ورانہ صلاحیتوں اور مضبوط کردار کے لیے مشہور ہوں۔ ایسے لوگ جو ای ایف یو کے مقاصد کو آگے بڑھانے، عوام کو اس ادارے سے روشناس کرنے میں مدد فراہم کرسکیں جس کا بنیادی کام صرف سرمایہ کاری کرنے والے حصے داروں کے مالی مفادات ہی نہیں بلکہ دراصل بیمہ داروں کی ضروریات کی نگہداری کرنا ہے، جن کے بغیر کمپنی کا وجود ہی باقی نہیں رہ سکتا۔

ان کے ذہن میں ایسے چند عظیم لوگوں میں سے ایک شخصیت ایس ایم یوسف کی تھی جس سے وہ عباس خلیلی اور عثمان علی کی طرح واقف ہوئے تھے۔ جب ان کی یوسف صاحب سے ملاقات ہوئی اس وقت تک یوسف صاحب کی پہچان ایک قابلِ احترام اور معروف سرکاری افسر کے طور پر ہوچکی تھی جن کی پیشہ ورانہ اور ذاتی دیانت داری ضرب المثل بن چکی تھی۔ ای ایف یو کے میڈیکل ڈائریکٹر ڈاکٹر تاج الدین مانجی کے الفاظ میں، جو طبی شعبے میں خود اپنا ایک مقام رکھتے ہیں، یوسف صاحب ''ایک دیوقامت شخصیت'' تھے۔

میرے لیے یہ بڑے فخر کی بات تھی کہ میری ان سے اچھی واقفیت ہوچکی تھی۔ جیسا کہ اس کتاب کے قاری سمجھ گئے ہوں گے، یوسف صاحب سے میری واقفیت میرے دوست روشن علی بھیم جی کے مکان پر دی گئی متعدد دعوتوں میں ہوئی تھی اور وہ مجھے پہلی ہی نظر میں پسند آگئے تھے۔ اس وقت تک میری ملاقات بہت سے سرکاری افسران سے ہوچکی تھی مگر سچ تو یہ تھا کہ اس وقت میری ملاقات ایسے شخص سے ہوئی تھی جو صحیح معنوں میں ایک سرکاری افسر تھا۔ جو ہر پہلو سے ایک ICS کی جیتی جاگتی تصویر تھا۔ دراز قد، سر سے پاؤں تک ایک مکمل جنٹل مین۔ ان کا اندازِ تقریر بڑا منفرد تھا، بہت تیز نہیں، باضابطہ، ہمیشہ برمحل۔ غیر ضروری رنگوں سے مبرّا۔ یہ جانتے ہوئے کہ میں ایک جرمن ہوں، وہ جرمنی کے صدر کے حالیہ دورے کے بارے میں باتیں کرتے، اور یہ بھی کہ ذاتی طور پر وہ گوئٹے، کانٹ، باخ اور بیتھوون کی سرزمین کے بارے میں کیسے خیالات رکھتے تھے۔ یہ وہی زمانہ تھا جب مجھ پر اقبال کی شاعری اور فلسفے کے رموز آشکار ہورہے تھے۔ جلد ہی ہم اقبال پر جرمنی کے عظیم لکھنے والوں اور دانشوروں کے اثرات کے بارے میں باتیں کرنے لگے تھے۔ ہم نے میونخ میں اقبال کی تعلیم کے دوران قیام کی یادگار کے بارے میں بھی باتیں کیں تھیں۔

ایس ایم یوسف نومبر ۱۹۱۴ء میں لاہور میں پیدا ہوئے اور ۲۱ برس کی عمر میں انھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے گریجویشن کیا۔ اس کے بعد ICS میں بھرتی کے سلسلے میں وہ آکسفرڈ کے سینٹ جان کالج میں زیرِ تعلیم رہے تھے۔ انگلستان سے واپسی پر وہ یونائیٹڈ پراونسز (یوپی) میں تعینات ہوئے۔ اپنی اعلیٰ کارکردگی کی وجہ سے ان کی نئی دلّی کے مرکزی دفاتر میں تعیناتی ہوگئی۔

تقسیم کی موقعے پر یوسف صاحب قائدِاعظم محمد علی جناح کے افسرِتعمیل (Aide) متعین ہوئے۔

ان کے قریب ترین دوست اور ساتھی عباس خلیلی کہتے ہیں کہ ''اس خوب رو اور نوجوان سکریٹری کو قائد سے ذاتی قربت حاصل کر لینے میں زیادہ دیر نہیں لگی جو ان کے نزدیک تمام خوبیوں، راستی اور دیانت داری، اور خود داری کا مجسمہ تھا۔ وعدے کے پکّے اس انسان نے کبھی اپنے اختیارات پر فخر نہیں کیا اور ہمیشہ کاسہ لیسوں اور مفاد پرستوں سے فاصلہ رکھا۔''

اپنے طویل سرکاری افسری کے اور عوام کی خدمات گاری کے زمانے میں یوسف صاحب نے ایسا کردار پیش کیا تھا جس نے ان کو کبھی نہ ختم ہونے والی عزت اور احترام سے نوازا۔ انھوں نے جو کچھ بھی کیا اس میں ان کا ضمیر ہمیشہ ان کی رہنمائی کرتا تھا۔ ونسٹن چرچل کے مطابق انھوں نے اپنی یادداشتوں کے لیے وہی ڈھال بنائی تھی جو اہم تھی، یعنی دیانت داری اور خلوص کی، عمل کی جس نے ان کو سر اُٹھا کر چلنے والوں کے ساتھ چلنے کا حوصلہ دیا۔

پہلے قائدِاعظم کے، ان کے بعد لیاقت علی خان کے اور ان کے بعد گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین کے ذاتی معاون کی حیثیت میں انھیں ایسے منفرد مواقع فراہم ہوئے تھے جن میں انھوں نے بڑے آدمیوں کو بہت قریب سے کام کرتے دیکھا تھا۔ انھیں ہر ایسے شخص سے قربت رہی تھی جو ملک کے لیے اہم تھا، اور اُن ہی ذرائع سے انھیں مختلف وزارتوں اور ان سے منسلک اداروں کے ساتھ کام کرنے کے مواقع ملے تھے۔ جوٹ بورڈ ڈھاکا کے چیئرمین، WPIDC کراچی کے رُکن، منرل ڈیولپمنٹ کارپوریشن کے چیئرمین کی حیثیت میں انھوں نے روز مرّہ کے مسائل کا کامیابی سے مقابلہ کرنے میں اپنی ہنرمندی دکھائی۔ وفاقی حکومت کی مختلف وزارتوں میں سیکریٹری کی حیثیت سے انھوں نے بہت سے کامیاب معاشیاتی منصوبوں کی تدوین میں بہت سے وزرا کی مدد کی تھی۔

وزارتِ خارجہ کے سیکریٹری کی حیثیت سے یوسف صاحب نے خارجی تعلقات کے ذریعے ملک کی معاشی وسعت کو اجاگر کیا جس نے علاقائی امدادِ باہمی کو بڑھاوا دیا۔ ان کی آخری تعیناتی پاکستان اسٹیل کے چیرمین (نائب وزیر کے برابر) کی حیثیت سے ہوئی تھی جس کی بنیاد رکھنے میں انھوں نے حقیقی راست بازی سے کام لیا۔ ان کی سرکاری ملازمت نومبر ۱۹۷۱ء تک چلی تھی اور اس دوران ان کو دو بار ستارۂ پاکستان اور ہلالِ قائدِاعظم کے اعزازات سے نوازا گیا۔

سرکاری ملازمت سے فراغت کے بعد انھوں نے Associated Consulting Engineers (ACE) کے چیئرمین کا عہدہ سنبھالا۔ یہ ادارہ جس کی بنیاد ان کے عزیز ترین دوست عباس خلیلی نے رکھی تھی، پورے پاکستان اور مشرقِ وسطیٰ میں مشہور تھا۔ ابتدائی مشکلات کے بعد یہ ادارہ بہت کامیابی سے چلایا گیا جس نے بہت سے لوگوں کو ملک سے باہر ملازمتیں فراہم کیں۔ یوسف صاحب اس عہدے پر بارہ برس تک فائز رہے اور اس ادارے کو آخری وقت تک بے مثال طریقے سے چلایا۔ اس ادارے کے مؤسس کے الفاظ میں ''ادارے کے لیے ان کی انمول خدمات سنہرے حرفوں میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔''

اپنے دوست عباس خلیلی کے ایک اور منصوبے پاکستان ریفائنری، چاٹگام کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے چیئرمین کی حیثیت سے بھی انھوں نے کام کیا۔ وہ پاکستان کیمیکلز کے، Exon کے اور کئی برس تک ایسٹرن فیڈرل یونین کے بھی ڈائریکٹر رہے۔ جن لوگوں نے انھیں کام کرتے دیکھا ہے وہ ان کی کارکردگی اور ان کی خدمات کے بڑے مداح رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جس حیثیت میں بھی انھوں نے کام کیا، ان کے ساتھیوں نے ہمیشہ اس کو سراہا ہے۔

یوسف صاحب کے بارے میں عباس خلیلی لکھتے ہیں، ''انسان سا انسان تھا وہ، جس عہدے پر بھی اس نے کام کیا اس کو عزت بخشی، خواہ وہ عہدہ حکومت کا یا نجی ادارے کا رہا ہو۔ کامیابی نے انھیں کبھی بدعنوان نہیں بنایا نہ ہی ناکامی نے ان کے تصورات اور ان کے عزائم کو کم زور کیا۔ دوستی میں ان کو ملکہ حاصل تھا۔ جتنے دوست انھوں نے بنائے تھے، شاید ہی کوئی انسان بنا سکا ہوگا۔ ہر شعبۂ حیات میں ان کے دوست

تھے، ہر طبقے کے لوگوں سے ان کی دوستیاں تھیں، اسکول کی جماعت سے کالج کے میدانوں تک، ضلعی کچہریوں سے سرکاری سیکریٹریٹ کی 'خانقاہوں' تک، اعلیٰ عہدوں والے سفارت کاروں سے بازار کے تاجروں تک، گالف کے میدانوں اور ٹینس کورٹ سے برج کی میزوں تک۔ پچیس برسوں پر محیط اسلامیہ کلب سے ان کے تعلقات نوجوانوں کے معاملات میں ان کی دل چسپیوں کے واضح مظہر ہیں۔ ان کی دوستیاں طویل اور گہری ہوتی تھیں۔ جس سے دوستی ہوگئی تو پھر نہ اس نے انھیں چھوڑا نہ انھوں نے اس کو۔ ان کے نزدیک دوستی صرف ایک فرد سے نہیں بلکہ خاندان سے ہوتی تھی۔ اصغر معیز شاہ سے ان کی صاحبزادی کی شادی سے دو اولاد ہوئیں جن سے وہ ٹوٹ کر پیار کرتے تھے۔ ان کا اکلوتا بیٹا شاہدان کی آنکھوں کا نور تھا۔ ان کی شریکِ زندگی بیگم زبیدہ یوسف نے زندگی میں انھیں ساری خوشیاں فراہم کیں۔ ہمیشہ ان کا ساتھ دیا، مشکل اوقات میں ان کی ہمت بڑھائی اور ایسی اخلاقی حمایت فراہم کی جیسی دنیا کی چند ہی عورتیں کرسکتی ہیں۔''

ان کے جگری دوست عباس خلیلی کے ان الفاظ سے بہتر شاید ہی کوئی اور ان کے بارے میں لکھ سکتا۔ ان سے مل کر میں ہمیشہ خوش ہوتا تھا اور مجھے اس بات کا بہت افسوس ہے کہ ۱۹۶۵ء میں میرے پاکستان چھوڑنے کے بعد سے صرف گاہے گاہے ہی ان سے ملاقات ہوتی تھی۔ میری یادوں میں ان سے ایک ہی ملاقات ایسی ہے جس کو میں کبھی بھلا نہیں سکوں گا۔ غالباً یہ ۱۹۷۰ء کی بات ہے، وہ پاکستان اسٹیل کے چیئرمین تھے اور میری کمپنی نے اپنا دفتر قائم کرنے کے لیے مجھے جاپان میں تعینات کردیا تھا۔ ان دنوں روشن علی بھیم جی سے برابر ملاقات رہتی تھی اس لیے کہ وہ اپنے اسکریپ یارڈ کے کاروبار کے سلسلے میں جاپان آتے رہتے تھے۔ اوساکا میں ان کی نمائندگی کرنے والے ایک صاحب، ناتھیانی تھے جن کا تعلق بمبئی سے تھا اور پہلے تو وہ صرف بھیم جی کی نمائندگی کرتے تھے۔ وہ ہندوستان سے جاپان اسکریپ کا مال برآمد کرتے تھے۔ انھیں کے مشورے پر بھیم جی نے بھی کراچی میں اپنا اسکریپ یارڈ قائم کیا تھا۔ بھیم جی نے اپنے دوست کی خاطر مدارات کے لیے مجھ سے فرمائش کی تھی اور اس طرح مجھے ٹوکیو میں یوسف صاحب کو خوش آمدید کہنے کا موقع ملا تھا۔ اس دوران ہم نے پورے برصغیر اور جرمنی کے درمیان تہ در تہ تہذیبی اور معاشیاتی رشتوں پر تبادلۂ خیالات کیا تھا۔ اسی دوران بین الاقوامی سطح پر معروف مستشرق پروفیسر این میری شمل کا تذکرہ بھی رہا جنھوں نے اقبال اور صوفیا پر بہت کام کیا تھا۔ وہ پاکستان برابر جاتی رہتی تھیں اور اپنی سرکاری حیثیت میں بھی یوسف صاحب سے ان کی ملاقاتیں رہتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ہمارے درمیان مشترک اور بھی دل چسپیاں تھیں، جاپانی کشتی، کچی مچھلی کھانے کا شوق، کابوکی تھیٹر اور جاپان کی موجودہ تہذیب پر گیشا (Geisha) خواتین کے اثرات وغیرہ جیسے موضوعات تھے جن پر ہم باتیں کرتے۔ در اصل ہمارے درمیان بات چیت کے لیے موضوعات کم پڑ گئے تھے۔ چوں کہ ہم دونوں کو گالف سے بہت دل چسپی تھی اس لیے کھیل میں عملی طور پر حصہ لیے بغیر بھی ہم گھنٹوں اس پر باتیں کرتے تھے۔ اگر کبھی موقع ملتا تو شاید دونوں کھیل بھی لیتے۔ ہم نے کئی بار کھیلنے کے بارے میں سوچا بھی تھا۔ یوسف صاحب کو اسلام آباد کے ہرے بھرے گالف کورس بہت یاد آتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ کبھی میں اسلام آباد کے گالف کورس کو دیکھتا، جس کے اساسی صدر یوسف صاحب ہی تھے۔ مجھے کئی ماہ قبل اس وقت اپنے دوست بہت یاد آئے تھے جب میں اپنے پیارے اور قریبی دوست روشن علی بھیم جی اور وفاقی شرعی عدالت کے چیف جسٹس جناب جسٹس محبوب سے ملنے اسلام آباد گیا تھا۔ اسلام آباد کے مقامی منیجر کے ہمراہ ہم تینوں رات کا کھانا کھانے اسلام آباد کلب گئے تھے اور جوں ہی ہم داخل ہوئے، سامنے آویزاں بڑی سی چوبی تختی پر لکھے ہوئے تمام سابقہ صدور کے ناموں کے ساتھ، مگر سب سے اوپر، یوسف صاحب کا نام کندہ نظر آیا تھا۔ بعد کی نسلوں کے لیے یہ ایک خوب صورت یادگار تھی جو ایک نوزائیدہ ملک کے ایک عظیم سپوت کے لیے ایک موزوں خراجِ تحسین تھا جس کو اپنی زندگی میں اس ملک کے لیے بہت کچھ کرنے کا موقع ملا تھا اور جس نے بین الاقوامی سطح پر اپنے ملک کا نام اجاگر کیا تھا۔ مجھے ان کا نام پڑھ کر فخر کا احساس ہوا اس لیے میں ان سے اپنے دوستی کے حوالے سے خود پر فخر کرتا تھا۔

میں اپنے ان لمحات کو ہمیشہ اپنی یادوں کے خزانے میں محفوظ رکھوں گا جن میں ہم دونوں ملا کرتے تھے، جو صرف خلوت کی

دعوتوں پر اور مختلف مسائل پر گفتگو میں گزرتے تھے۔

یوسف صاحب نے ۲ راپریل ۱۹۸۷ء کو انتقال کیا۔ روشن علی بھیم جی نے دوسرے دن مجھے فون پر اطلاع دی۔ وہ مرحوم کے سوئم میں شرکت کے بعد واپس ہوئے تھے، جو ایک بے مثال انسان تھے اور جن کے بارے میں وہ بڑے احترام اور خلوصِ دل کے ساتھ باتیں کیا کرتے تھے۔ یوسف صاحب سے ملاقات کے بعد مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ بھی روشن علی بھیم جی کے بارے میں اسی نوع کے جذبات رکھتے تھے۔

یوسف صاحب کے انتقال پر عباس خلیلی ان خوب صورت الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا تھا:

''ہم ایس ایم یوسف کو ایک گرم جوش اور محبت کرنے والے انسان کے طور پر یاد رکھنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچایا، ہمیشہ امداد کے خواہاں لوگوں کی مدد کی۔ بوڑھا ہو یا جوان وہ سب کے لیے حاضر رہتے۔ ہماری چالیس سالہ رفاقت، جو ۱۹۴۷ء میں شروع ہوئی تھی پلک جھپکتے ۱۹۸۷ء میں انجام کو پہنچی۔ مگر سچ مچ ایسا نہیں ہے۔ وہ ہماری یادداشتوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے، جیسا کہ ایک فارسی شاعر نے کہا ہے:

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

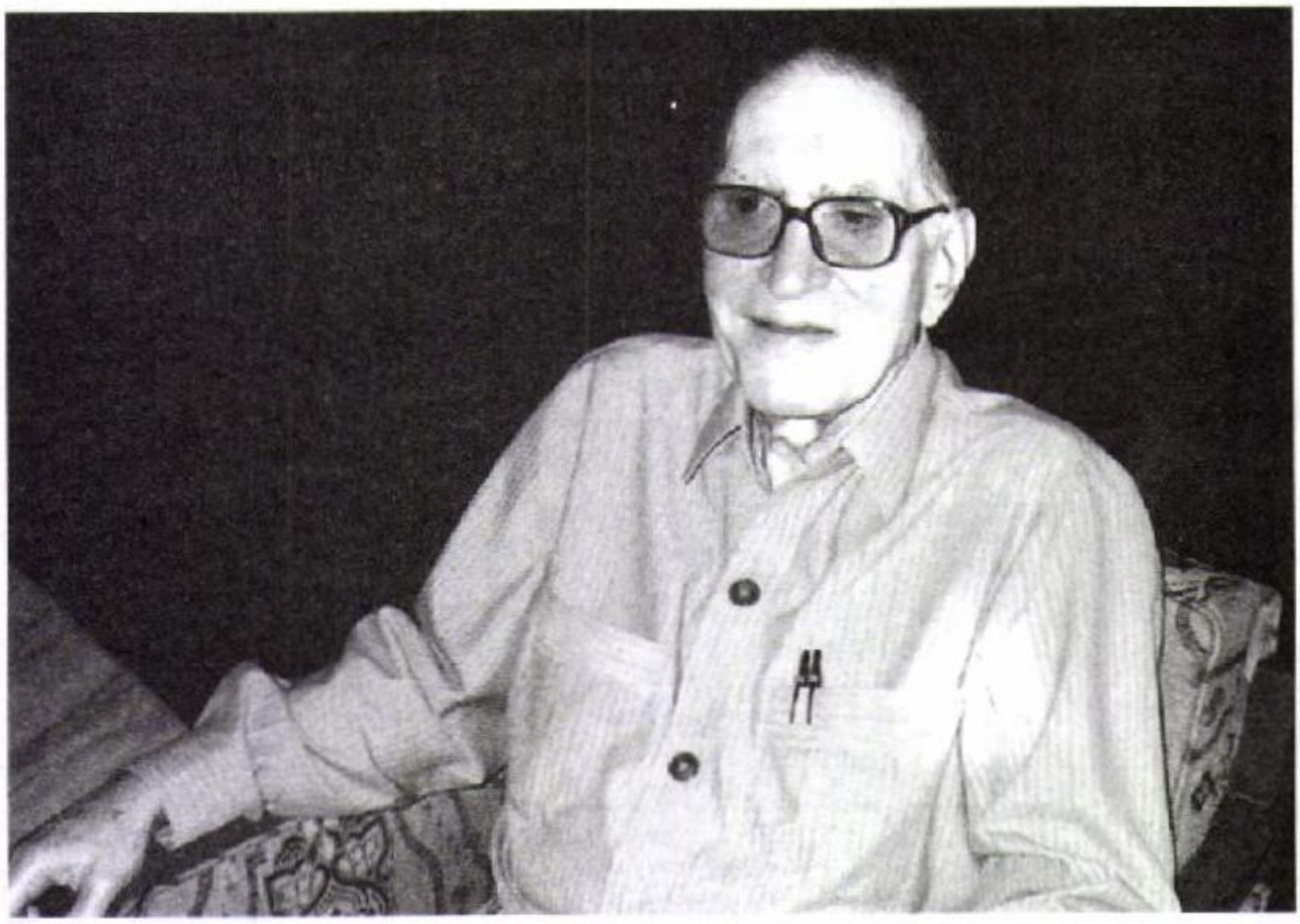

سعید احمد ۱۹۹۷ء میں سندھ کلب میں

روشن علی بھیم جی ای ایف یو کے زیرِ تربیت افراد سے سعید احمد کا تعارف کراتے ہوئے

سعید احمد

اعتبار کا قلعہ

جب پاکستان وجود میں آیا تو ملک کو بالکل نئے سرے سے شروعات کرنی پڑی تھی۔ مغربی اور مشرقی پاکستان دونوں بازوؤں میں شاید ہی کوئی صنعتی ادارے رہے ہوں۔ بنیادی طور پر یہ ایک زراعتی قوم تھی جس کی دولت پٹ سن اور کپاس پر منحصر تھی جو برآمد کے کام آتی تھیں۔ اس ملک کی سب سے بڑی دولت اس کے ایک سو بیس ملین عوام تھے۔ مگر ان میں سے زیادہ تر کو تعلیم کے مواقع نصیب نہیں ہوئے تھے۔ ملک کے باشندوں کی ایک بڑی اکثریت جاگیرداروں اور زمینداروں کے رحم و کرم پر زندہ تھی۔ ان میں کچھ تو با اثر افراد کے غلاموں جیسے تھے۔ دو طبقے ایسے تھے جو ابتدائی دنوں ہی سے ملک کے ستون سمجھے جاتے تھے جن پر قوم کا انحصار تھا اور جن کے بغیر شاید ملک کی تاریخ ہی اور ہوتی، یعنی فوج اور سرکاری ملازم۔ سرکاری ملازمین میں ICS (انڈین سول سروس) کے افراد تھے جو ملک کے بہترین ذہنوں میں سے منتخب تھے۔ اور تعجب نہیں کہ جب ملک کو اپنی حکومت کی مشین تیار کرنی تھی تو انھیں لوگوں پر انحصار ایک مجبوری تھی، جنھوں نے ہندوستان کے مختلف اداروں سے اپنے نئے وطن پاکستان تبادلے کا فیصلہ کیا تھا۔ ان میں جو اہم اور قابلِ ذکر نام تھے ان میں غلام محمد، ایس ایم یوسف، عباس خلیلی، غلام فاروق، عقیلی، ممتاز حسن، زاہد حسین، سعید احمد اور کئی دوسرے شامل تھے جو ملک کے دوسرے عشرے میں ہونے والی سیاسی اور معاشی ترقی کے حوالے سے ملک میں زبان زدِ عام ہونے والے تھے۔

مجھے مواقع میسر تھے جن کی بنا پر، جیسا کہ میں اس کتاب میں بیان کر چکا ہوں، ان میں سے بہت سے افراد سے ذاتی تعلقات استوار ہو گئے تھے۔ کچھ سے تو بس واجبی سی شناسائی تھی مگر کچھ ایسے بھی تھے جن سے اچھی طرح واقفیت ہوگئی تھی۔ ان ہی میں سے سعید احمد بھی تھے۔ یہ سرکاری افسران کے اسی ممتاز اور قابلِ فخر طبقے سے تعلق رکھتے تھے، پاکستان کے پہلے بیس برسوں میں جنھوں نے ملکی معاملات میں نمایاں کردار ادا کیے تھے۔

ان ہی جیسے لوگ، جن کا میں نے ابھی تذکرہ کیا ہے، معاشیاتی اور صنعتی میدانوں میں ملکی ترقی کے روشن دماغ تھے۔ وہ سارے ملک، حکومتیں، ادارے اور افراد جو ان دنوں دنیا کے معاملات چلا رہے تھے ان افراد کی ہمت، ولولہ انگیزی اور بصیرت کے قائل تھے۔ اور میرے اپنے خیال کے مطابق میرے دوست جناب سعید احمد ان روشن دماغ لوگوں میں سے تھے جن کی دیانت داری پر کسی کو کبھی شک نہیں ہوا تھا اور جن پر سب اعتماد کرتے تھے۔ اگر میں نے اس شخصیت کے بارے میں کچھ تفصیلات اس کتاب میں بیان نہ کیں، جو ایسٹرن فیڈرل یونین کے ممتاز ڈائریکٹروں میں سے تھے، تو ان کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ مجھے اس بات کی زیادہ خوشی ہے کہ میرے دوست، اپنی عمر کے آٹھویں عشرے میں ہیں، اب بھی نہ صرف بقیدِ حیات ہیں بلکہ اس ملک کی ترقی پر نظر رکھے ہوئے ہیں جس کو انھوں نے اُس وقت اپنا وطن بنایا تھا جب پاکستان کا خواب شرمندۂ تعمیر تعبیر ہوا تھا۔

سعید احمد ۱۹۱۳ء میں غیر منقسم پنجاب کے شہر امرتسر میں پیدا ہوئے تھے۔ کلکتہ یونی ورسٹی سے گریجویشن کرنے کے بعد انھوں نے بینکنگ کی صنعت میں شمولیت کا فیصلہ کیا۔ ان کے اپنے الفاظ میں وہ طالب علمی کے زمانے ہی سے اس پیشے کے گرویدہ تھے۔ ان کے والد پولیس کے محکمے میں افسر کی حیثیت سے ملازم تھے۔ سعید احمد نے اپنے والد کی اجازت سے امپیریل بینک میں ملازمت کی درخواست دی۔ ''میرے دو دوست اس بینک میں کام کر رہے تھے اور انھوں نے مجھے بتایا کہ اس ادارے میں ایک اسکیم کے تحت ''آزمائشی مدت کے معاونِ کار'' رکھے جا رہے تھے۔ منتخب لوگوں کو تربیت کے دوران بھی اچھی تنخواہ دی جا رہی تھی۔'' جب سعید احمد ماضی کی یادوں سے بینک میں اپنی ملازمت کی تفصیلات بیان کر رہے تھے تو ان کا مسکراہٹ بھرا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ ''مگر پھر جب ۱۹۳۳ء۔۱۹۳۴ء کی شدید مالی کساد بازاری آئی تو امپیریل بینک پر بھی اثر انداز ہوئی اور ملازمت کی یہ اسکیم ختم کر دی گئی تھی مگر انھوں نے مجھے ایک زیرِ تربیت ملازم کی آسامی کی پیش کش کر دی جو میں نے بخوشی قبول کر لی۔ مگر انھوں نے یہ وعدہ ضرور کیا تھا کہ اگر میری کارکردگی ان کے معیار پر پوری اُتری تو مجھے افسری کی سطح پر ترقی دے دی جائے گی۔ تو میں نے کمپنی کے صدر دفتر، کلکتے میں اپنی تربیت شروع کر دی۔ اس وقت اتنی بڑی عمارت میں صرف میں ہی ایک مسلمان کام کر رہا تھا۔ میرے سوا ایک بھی مسلمان نہیں تھا وہاں، مسلمان افسروں کا سوال ہی نہیں۔ میں واقعی خود کو وہاں بہت بے چین اور تنہا محسوس کر رہا تھا حالاں کہ وہاں کا ماحول اچھا خاصا تھا، نہ کسی قسم کی تعصب تھا نہ مسلمانوں کے خلاف جذبات تھے۔ ہم سب ایک ہی مقام سے ایک ہی طبقے اور ایک ہی سطح کے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اس وقت میری عمر چوبیس برس کی تھی۔ بعد میں میرا تبادلہ بینک کی امرتسر شاخ میں کر دیا گیا۔ دراصل کام کی زیادتی کی وجہ سے انھیں مدد کی ضرورت تھی اس لیے مجھے وہاں بھیج دیا گیا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اس شاخ میں ایک مسلمان بھی ملازم تھا جس نے میری بہت مدد کی جب کہ دوسرے مجھے بالکل نظر انداز کرتے اور میری کسی قسم کی مدد کے لیے تیار نہ تھے۔ مسلمانوں کے علاوہ میرے ساتھیوں میں ایک شخص تھا جس نے کام کے بارے میں میرا علم وسیع کرنے میں میری مدد کی، وہ ایک نوجوان پارسی تھا۔ اس کے علاوہ بینک میں زیادہ تر انگریز تھے جن میں اسکاٹش کی تعداد زیادہ تھی۔ وہاں ملازمت سے مجھے بہت خوشی ہوئی کہ میرے علم میں بہت اضافہ ہوا۔ میں اس وقت لاہور میں تھا جب ریزرو بینک آف انڈیا بنا تھا اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، ان دنوں بینک کے کاروبار میں بہت کم مسلمان ملتے تھے۔ ان لوگوں کے درمیان یہ پیشہ کچھ زیادہ مقبول نہ تھا۔ میرے خیال میں اس کی بنیادی وجہ مذہبی نہیں تھی۔ مسلمانوں کی تہذیب میں اس پیشے کے بارے میں ایک قسم کی ناگواری پائی جاتی تھی۔ سودی لین دین بازاروں میں ہندو کرتے تھے۔ یہاں میں بینکوں کے حوالے سے بات نہیں کر رہا ہوں جو زیادہ تر غیر ملکوں، انگریزوں، کی ملکیت ہوتے تھے۔''

بہر حال جیسا کہ تقدیر نے چاہا تھا، سعید احمد کا مسلمان ہونا ہی ریزرو بینک، بمبئی میں ان کی ملازمت کا باعث ہوا۔ شاید سیاسی اعتبار سے اس کی ضرورت محسوس کی گئی تھی کہ اس نئے سرکاری ادارے میں کچھ مسلمانوں کو بھی ہونا چاہیے۔

جب تقسیم ہوئی اس وقت سعید احمد بمبئی میں اسسٹنٹ کنٹرولر آف فارن ایکسچینج کے عہدے پر فائز تھے۔ انھوں نے ملازمت کے لیے پاکستان کا انتخاب کیا اور ۱۹۴۸ء کے اوائل ہی میں وہ اور ان کے اہلِ خاندان پاکستان ہجرت کر گئے، جہاں پہنچتے ہی انھوں نے ریزرو بینک آف انڈیا کی کراچی شاخ میں کام کرنا شروع کر دیا۔

تقسیم کے وقت کے طے ہوا تھا کہ تیس جون ۱۹۴۸ء تک ہندوستان اور پاکستان دونوں کے مرکزی بینک مشترکہ ہوں گے، اس کے بعد اسٹیٹ بینک آف پاکستان کو وجود میں آنا تھا۔ اس وقت تک ریزرو بینک آف انڈیا کی کراچی شاخ کو سارے مالیاتی فرائض ادا کرنے تھے۔ میں نے جو کچھ سرکاری افسروں کی قابلیت اور کاروباری معیار کے بارے میں کہا اس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ باوجود گوں ناگوں مشکلات اور دباؤ کے جوان اہل کاروں پر تھا، یہ کام مقررہ وقت میں انجام کو پہنچا۔ ساری اَن ہونیوں اور مشکلات کے باوجود یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو اسٹیٹ بینک آف پاکستان کا افتتاح قائدِ اعظم کے ہاتھوں ہوا۔ اتفاق ہے کہ قائدِ اعظم اس افتتاح کے بعد، بالخصوص جس کے لیے انھوں

نے کوئٹہ سے کراچی کا ہوائی سفر کیا تھا، منظرِ عام پر نہیں آ سکے۔ اس سلسلے میں زاہد حسین صاحب نے بہت کام کیا تھا جو اسٹیٹ بینک کے موئسس بھی تھے اور پہلے گورنر بھی۔ اور ان کے معتمد اور لائق ساتھیوں میں سے ایک سعید احمد تھے۔

ان ہی دنوں سعید احمد کو ایک ضروری سرکاری کام سے بمبئی جانا پڑا جہاں ان کی ایک ایسے شخص سے ملاقات ہوئی جس سے وہ پہلے کبھی نہیں ملے تھے، مگر جو بعد میں ان کا قریبی ساتھی بن گیا۔ میری مراد روشن علی بھیم جی سے ہے۔ کس طرح یہ دونوں پہلی بار ملے، اس کی تفصیلات سعید احمد نے خود مجھے بتائیں جب وہ ملازمت سے فارغ ہو چکے تھے اور کافی دنوں سعودی عرب کی مالیاتی ایجنسی کے مشیر رہ کر پاکستان واپس پہنچے تھے۔

''یہ ۱۹۴۹ء کی بات ہے جناب روشن علی بھیم جی سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اور جن حالات کے پیشِ نظر ہم دونوں کی ملاقات ہوئی اس کا بتانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس کو ایک دن سیاسی اور تاریخی پس منظر میں دیکھا جانا ہے۔ ریزرو بینک آف انڈیا اور اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے مابین اثاثوں کی تقسیم ہونی تھی۔ اور یہ گردش میں موجود کرنسی نوٹوں کی بنیاد پر ہونے تھے جو پاکستان سے بمبئی بھیجے جانے والے تھے۔ اثاثے سونے کی سلاخوں، حصص اور زرِمبادلہ پر مشتمل تھے۔ اس لیے ہم لوگ کراچی سے بمبئی اپنے لوگوں کے ہاتھوں کرنسی نوٹ بمبئی بھیجتے جہاں ان کی جانچ پڑتال ہوتی اور پھر ان کا رجسٹریشن ہوتا تھا۔ ان کے عوض اثاثے جاری کیے جاتے جو ہم تک پہنچائے جاتے۔ بدقسمتی سے ان تبالوں میں بہت تاخیر ہوتی تھی اور چوں کہ ریزرو بینک کے ڈپٹی گورنر Sir Cecil Trevor سے میرے ذاتی مراسم تھے اس لیے مجھے بھیجا گیا تھا تاکہ میں معاملات کو خوش اسلوبی سے طے کرادوں۔ اس سلسلے میں تمہیدی خط کتابت ہو چکی تھی اور Sir Cecil نے پیغام بھیج دیا تھا کہ وہ بمبئی سے کراچی آمد کے منتظر ہیں اور یہ بھی کہ جہاں تک ہو سکا وہ سونا اپنے ساتھ لانے میں میری مدد کریں گے۔ لہٰذا ہم نے پاکستان ایئر فورس کے ایک مال بردار جہاز کا انتظام کیا اور خوش قسمتی سے اس کو کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔ میں نے بینک سے ہوائی اڈّے تک سونے کی ترسیل کے لیے ایک بکتر بند گاڑی کرائے پر حاصل کی۔ ان دنوں بمبئی میں حالات بہت خراب ہو رہے تھے اس لیے اگر پاکستان لے جائے جانے والے قیمتی اثاثے کی خبر پھیلے تو اس کو خطرات لاحق ہو سکتے تھے۔ میں نے سوچا کہ ان اثاثوں کی راہ داری کے دوران خطرات کا بیمہ کرالیا جانا چاہیے۔ میں نے اپنے اسٹیٹ بینک کے گورنر سے مشورہ کیا اور انھوں نے میری تجویز سے اتفاق کیا۔ سو میں نے بمبئی میں بیمے کے لوگوں سے بات کی مگر اس خطرے کے بیمے کے لیے کوئی راضی نہیں تھا۔ کوئی اس مال کو جو پاکستان لے جایا جانا تھا، چھونا بھی نہیں چاہتا تھا۔

ان حالات کے پیشِ نظر مجھے کیا کرنا چاہیے، اس سلسلے میں اپنے دوستوں سے مشورے کیے۔ ان میں سے ایک مسلمان نے ایک نام پیش کیا تھا، روشن علی بھیم جی۔ وہ بمبئی کے معروف بیمہ ایجنٹ تھے جن کے بیمے کی صنعت میں کافی تعلقات تھے اور خیال تھا کہ وہ واحد انسان ہیں جو اس سلسلے میں میری مدد کر سکیں گے۔ لہٰذا میں نے ان سے رابطہ کیا۔ میں نے ان کو بہت خوش اخلاق، ماہر پیشہ ور اور مددگار پایا۔ انھوں نے کہا کہ وہ لندن میں اپنے دوست بروکروں کی مدد سے ''کوانشورنس'' کے ذریعے اس مسئلے کا حل نکالنے کی کوشش کریں گے۔ اور وہ اس کوشش میں کامیاب ہو گئے، انھوں نے سب کچھ طے کرادیا جس نے مجھے بہت متاثر کیا۔ مگر تاریخ کی خاطر مجھے سونے کی ترسیل کے اس واقعے کی تکمیل کرنی ضروری ہے۔

جب ہمارا خزانہ بار ہو چکا، سبز سگنل دیا جا چکا تھا اور ہوائی جہاز اُڑنے ہی والا تھا کہ اچانک جہاز کے ہوا باز کو پیغام ملا کہ جہاز کو اڑنے سے روک دیا جائے اور جہاز کو ہوائی پٹی سے واپس اڈے کی طرف لے آیا جائے۔ میں یہ سب کچھ دیکھ اور سن سکتا تھا اس لیے کہ میں خود بھی جہاز پر سوار تھا اور ساری کارروائی میرے اشارے پر ہی ہو رہی تھی۔ مڑتے وقت جہاز کا ایک پہیہ ہوائی پٹی سے اُتر گیا تھا۔ ہوا باز کی بارہا کوشش کے باوجود پھنسا ہوا پہیہ نکالا نہیں جا سکا۔ میں نے خود جہاز سے اُتر کر ریزرو بینک میں اپنے دوستوں کو ٹیلی فون کیا اور Sir

Cecil سے بھی بات کی اس لیے کہ ہوائی اڈے کے اربابِ اقتدار ہماری سُن ہی نہیں رہے تھے۔ Sir Cecil نے از راہِ مہربانی ایک ٹریلر جیسی کسی گاڑی کا انتظام کرادیا جس کی مدد سے جہاز کے پھنسے ہوئے پہیے کو نکالا گیا اور بالآخر جہاز نے پرواز کی۔ میرے افسر جناب زا حسین ہماری کارکردگی سے بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے بار بار بیمہ کرانے کے ہمارے فیصلے کو سراہا اس لیے کہ ہمارا جہاز تقریباً سارا وقت ہندوستانی فضاؤں میں پرواز کرتا رہا تھا۔ میری اور روشن علی بھیم جی کی دوستی کی ابتدا اس طرح ہوئی تھی۔ انھوں نے پاکستان کی خاطر ہماری م کی جو پاکستان کے لیے تھی۔ ذرا سونے سے بھرے ہوئے ایک ہوائی جہاز کا تصور کیجیے، لبالب سونے سے بھرا ہوا!

جب جناب بھیم جی پاکستان آئے، غالباً ۱۹۵۲ء میں، تو انھوں نے مجھ سے رابطہ کیا اور ہم دونوں اچھے دوست بن گئے۔ اور پ ۱۹۶۰ء میں انھوں نے ایسٹرن فیڈرل یونین کی زمام انتظام سنبھال لی، اور چند برس بعد مجھے اس کمپنی میں ڈائریکٹر بننے کی پیش کش کی عباس خلیلی جنھیں میں قریب سے جانتا تھا، اس وقت کمپنی کے چیئرمین تھے اور کئی سربرآوردہ شخصیات بورڈ میں شامل تھیں۔ اس ادارے می شمولیت میرے لیے خوشی اور اعزاز کی بات تھی۔ روشن علی بھیم جی کی سربراہی میں یہ ادارہ بڑا، مالی طور پر مضبوط اور کاروبار کے معاملے میں طاقتور بن چکا تھا۔ عباس خلیلی چیئرمین کی حیثیت سے کمپنی کے لیے بڑا اثاثہ تھے۔ قصہ مختصر، ان دنوں ای ایف یو ایک بڑا اور نہایت طاقت ادارہ بن چکی تھی، بلکہ میں تو اس کو ایک قومی انسٹی ٹیوشن کہوں گا۔ ان دنوں کی یادیں میرے دل و دماغ میں اب تک محفوظ ہیں، کہ مجھے اس کے بورڈ میں شامل ہو کر خدمت کا موقع دیا گیا تھا۔''

جناب سعید احمد نے، جس حیثیت میں بھی ممکن ہو سکا، ہمیشہ پاکستان کی حکومت اور اس کے عوام کی خدمت کی، جذبے کے ساتھ اور سرگرمی کے ساتھ۔ وہ ہمیشہ سے داخلیت پسند آدمی تھے، بہت خاموش مگر کھلی اور متجسس آنکھوں والے۔ ان کا کسی مسئلے کو حل کرنے کا انداز مجھے پسند تھا۔ چوں کہ وہ صبر آزما سننے والے انسان تھے۔ قبل اس کے اس میں کود پڑیں، وہ ذرا پیچھے ہٹ کر مسئلے پر غور کرنے کے عادی تھے لیکن ایک بار وہ فیصلہ کر لیں تو لوگ ان پر اعتبار کرتے تھے۔ اپنے ایک دوست کے الفاظ میں وہ ایک ''اعتبار کا قلعہ'' تھے۔ جب میری ا سے شناسائی ہوئی اس وقت وہ ڈپٹی کنٹرولر آف فارن ایکسچینج تھے، ایسے عہدے پر جو پیسے بنانے والے لوگوں کے لیے پُرکشش تھا، مگر ہمار دوست سعید احمد کے لیے نہیں۔ وہ کسی کے لیے بھی ''غیر ضروری'' مدد کرنے کے قائل نہیں تھے، حتیٰ کہ اپنے قریبی دوستوں کے لیے بھی۔ ا کی دوست نما اور مہربان شخصیت کے نیچے، پاکستان کی سول سروس کے اعلیٰ طبقوں کے بلند معیارِ دیانت کے مطابق بھی، ایک ناقابلِ تبد دیانت داری چھپی ہوئی تھی جو ناقابلِ شکست بھی تھی۔ وہ اصولوں کی پاسداری سمندری لہروں کے بیچ ایک چٹان کی مانند کرتے تھے مگر یہ س کچھ وہ پُرکشش مسکراہٹ کے ساتھ کرتے تھے۔ اس طرح کہ ان کے قریبی دوست بھی ان کے انکار کو خنداں پیشانی سے قبول کر لیتے تھے۔

ایک اپنے اصولوں والی فطرت رکھنے والے ان جیسے انسان کے لیے ایوب خان کی نرم خو فوجی حکومت اس وقت کے ترقی پذ پاکستان کے حالات کے لیے مناسب رہی ہوگی۔ وہ مضبوط اعتقادات والے انسان تھے اور ہمیشہ اس کی نگہداری کرتے تھے۔

میرے اس سوال کے جواب میں کہ وہ پاکستان کے ماضی کے دنوں کو کس طرح دیکھتے ہیں انھوں نے کہا، ''میں سمجھتا ہوں کچھ دنو تک ہم صحیح سمت میں جا رہے تھے۔ لیاقت علی خان کے قتل کے بعد بدقسمتی سے کچھ بدنظمی اور عدم استحکام پیدا ہو گیا۔ قائدِ اعظم بھی ذرا جلد ہمیں چھوڑ گئے تھے۔ ان کے بعد ایک دور ایسا آیا تھا جس میں سیاست داں کھینچا تانی میں مصروف ہو گئے تھے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ وہ س منتخب سیاست داں نہیں تھے۔ یہ سب ہندوستان کی پُرانی قومی اسمبلی کے ارکان تھے جو پاکستان آ گئے تھے اور پنجاب، شمالی سرحد، سندھ اور بنگا کی نمائندگی کر رہے تھے۔ وہ ووٹ کے ذریعے اقتدار میں نہیں آئے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ ان کے پاس صحیح معنوں میں اختیارات نہیں تھے صرف اس لیے کہ وہ مرکزی اسمبلی کے ارکان رہ چکے تھے اس لیے وہ پاکستان کی قومی اسمبلی کے رُکن بن گئے تھے۔ اور پھر غلام محمد نے اقتد سنبھال لیا اور بالآخر سیاسی بیداری اور آگاہی کی وہ تمام نرم جڑیں جو نئے ملک کی سرزمین میں پیوست ہو رہی تھیں ان کو اکھاڑ کر پھینک دیا گیا

مگر وہ بہت بوڑھے اور کم زور ہو گئے تھے، ان کی صحت بھی خراب رہتی تھی۔ اسکندر مرزا کی مدد سے جنرل ایوب خان نے ان کو اور ان کی کٹھ پتلی حکومت کو نکال باہر کیا۔ اور پھر پاکستان کے 'سنہرے دور' کا آغاز ہو گیا۔ میرا خیال ہے کہ میرے ہم عصر لوگوں کی اکثریت مجھ سے اتفاق کرے گی۔ وہ ہماری تاریخ کا بہترین دور تھا۔ ہمارے ملک میں صنعتی اور معاشیاتی میدانوں میں بہت ترقی ہوئی۔ اس دور کی دنیا کی اہم طاقتوں کے نزدیک ایوب خان محترم ٹھہرے۔ مگر یہ سب کچھ ایک شخص کے عوامی تصورات اور انا پرستی نے زمیں بوس کر دیا جس نے ایک آن میں بہت ساری صنعتوں، بینکوں، بیمہ کمپنیوں، جہاز رانی کے اداروں وغیرہ کو قومی ملکیت میں لے لیا۔ اُس پر مستزاد یہ کہ ہم نے مشرقی پاکستان کھو دیا۔ میں کوئی سیاست داں ہوں نہ کبھی رہا ہوں، اس لیے میں اس بات پر بحث نہیں کرنا چاہتا کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی سے احتراز کیا جا سکتا تھا یا نہیں۔ میں صرف ان پہلوؤں کے بارے میں اظہارِ خیال کر سکتا ہوں جو بالواسطہ یا بلا واسطہ میرے فرضِ منصبی سے متعلق تھے۔ جب یہ سب کچھ قومیائے جانے کے واقعات ہوئے، میں PIDC کا چیئرمین تھا۔ اس حیثیت میں کچھ قومیائے ہوئے صنعتی اداروں کی ذمے داری مجھ پر بھی۔ اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے ڈپٹی گورنر رہنے کے بعد پہلے مجھے پانچ برس کے لیے PICIC بھیجا گیا تھا جہاں میں نے اس عظیم اور حیرت انگیز انسان عقیلی کی ماتحتی میں کام کیا۔ جب ایوب خان نے ان کو وزیرِ خزانہ بنا دیا تو ان کی جگہ میں چیئرمین بنا دیا گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے PICIC کا انتظام سنبھالا اور وہاں سے میں نے دیکھا کہ کس طرح پاکستان کے عوام کے نام پر پرانے مالکان اور پیشہ ور صنعت کاروں کو نکال کر ان کی جگہ ایسے لوگوں کو بٹھا دیا گیا جن کے پاس سوائے ایک مخصوص سیاسی پارٹی کی رکنیت کے کوئی اور سند نہیں تھی۔ مجھے یہ سب اس لیے معلوم ہوا کہ عارضی طور پر PIDC کو کچھ صنعتی اداروں کی اس وقت تک دیکھ بھال کرنی پڑی تھی جب تک کہ ان کے نئے منتظمین کا تقرر نہیں ہو گیا تھا۔ اور صنعتوں کو قومی ملکیت میں لیے جانے کے فوراً بعد کے دنوں میں جو کچھ ہوا اس کو میں کبھی بھلا نہیں سکتا۔ برسرِ اقتدار جماعت کے ایک اہم رُکن جو حکومتِ سندھ میں بارسوخ وزیر تھے، مجھ سے ملنے آئے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ ان کے پاس وزیرِ اعظم سے احکامات آئے ہیں اور انھوں نے مجھے وہ فہرست دکھائی جس میں سو سے زیادہ افراد کے نام تھے جن کو قومی ملکیت میں لیے جانے والے اداروں میں سربراہ یا اعلیٰ انتظامی عہدوں پر تعینات کیے جانے کے احکامات صادر کیے گئے تھے۔ اور اگر جگہیں نہ ہوں تو بھی ان کی تعیناتی کا کسی نہ کسی طرح انتظام کیا جانے کا حکم دیا گیا تھا۔ یہ تھا وہ طریقہ جس طرح ان دنوں حکومت چلائی جا رہی تھی۔ انھیں اپنے لوگوں کی مدد کرنی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ ان کے لوگوں کو ان تمام صنعتوں کے اہم عہدوں پر فائز کیا جائے جن کو قومی ملکیت میں لیا جا چکا ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اپنے لوگوں کو فیضیاب کیے جانے کا رواج پوری دنیا میں ہے اور بالخصوص اس علاقے میں جس کے سیاسی اور تہذیبی ماحول میں ہم رہتے ہیں۔ مگر سیاسی اعتبار سے بھی ہر کام کی ایک حد ہوا کرتی ہے۔ ایسے بڑے تجارتی اداروں کے اعلیٰ عہدوں کے ساتھ کھلواڑ کرنا، جو آپ کے ملک کی ریڑھ کی ہڈی کے مترادف ہوتے ہیں، بدترین نالائقی ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان لوگوں میں کچھ قابل لوگ بھی تھے مگر اس کھیل کے لیے جو عام 'اصول' اپنائے گئے تھے وہ دنیا کے کسی خطے میں بھی قابلِ قبول نہیں ہوتے۔ ایک بار آپ تجارتی اداروں کو سیاسی کھیل میں گھسیٹ لیں تو پھر، آپ جانتے ہیں کہ، ان سے کارکردگی میں چستی اور پیشہ وری کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

اس کے برعکس اسی نوع کے حالات میں ایوب خان کا رویہ کیا تھا، وہ بھی میں دیکھ چکا تھا۔ حکومت سے ان کے اخراج کے بعد سے جو کچھ ان کے بارے میں کہتے ہیں اس کو سُن کر مجھے بہت غصہ آتا ہے۔ ان کے بارے میں میرا تجربہ بہت مختلف تھا اور میں پوری طرح حکومت کے معاملات میں شامل تھا جب زمامِ اقتدار فیلڈ مارشل ایوب خان کے ہاتھوں میں تھی۔ میرے پاس مثال کے طور پر ایک واقعہ ہے جس سے ان کے ذاتی طریقۂ کار کا صحیح انداز ہوتا ہے۔ میں اس وقت PICIC کا چیئرمین تھا۔

ایک دن ایوب خان کا سب سے چھوٹا بیٹا طاہر، جو گوہر ایوب سے چھوٹا تھا، مجھ سے ملاقات کے لیے آیا اور ڈھائی ہزار تکلوں کی ایک ٹیکسٹائل مل لگانے کے لیے قرض دیے جانے کی درخواست کی۔ پہلے میں نے ان کی پوری بات سنی اس کے بعد میں نے ان سے کہا کہ وہ

سرکاری طور پر اپنے منصوبے کے لیے تحریری درخواست دیں، ہمارے ماہرین جس کی جانچ پڑتال کریں گے، اس کا قدری تخمینہ کیا جائے گا اور اس کے بعد فیصلہ کیا جائے گا کہ ہم اس منصوبے کے لیے قرض دے سکتے ہیں یا نہیں۔ طاہر ایوب نے مجھے کچھ استعجاب کی نظروں سے دیکھا مگر فوراً ہی سمجھ داری کا مظاہر کیا اور بغیر کسی غصے یا بیزاری کا اظہار کیے چلا گیا۔ اس کے بعد اس نے تمام کام کے لیے ذاتی کارروائی مکمل کی اور با قاعدہ اپنی درخواست داخل کر دی۔ درخواست کا تجزیہ کیا گیا، اس کو معاشیاتی اعتبار سے قابلِ قبول پایا گیا، مزید یہ بھی کہ اس منصوبے کی معاونت کرنے والے صاحبانِ حیثیت بھی تھے اور اس صنعت کو کامیابی سے چلانے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ میں نے سوچا کہ احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ قبل اس کے کہ یہ قرض منظور کیا جائے ہمیں اس کو صدر کے علم میں لانا چاہیے اس لیے کہ ان کا بیٹا اس منصوبے کا lead sponsor ہے۔ میں اسلام آباد گیا اور صدر کے پرنسپل سیکریٹی جناب فدا حسین سے ملا اور انھیں اس منصوبے کے بارے میں تمام نکات بتائے۔ وہ میری بات فوراً سمجھ گئے اور انھوں نے مجھ سے اتفاق کیا اور کہا کہ یہ اچھا خیال ہے کہ ایسے معاملات کو صدر کے علم میں ضرور لایا جانا چاہیے اور اس کو اس وقت تک منظور نہیں کیا جانا چاہیے جب تک کہ صدر اس پر اپنی رائے نہ دے دیں۔ لہٰذا دو تین ہفتے تک میں نے صدر کے ردِ عمل کا انتظار کیا۔ ایک دن فدا حسین صاحب نے ٹیلی فون پر بتایا کہ انھوں نے اس موضوع پر صدر سے بات کی تھی اور انھوں نے ہدایت کی ہے کہ میں اس منصوبے کو داخلِ دفتر کر دوں اور یہ بھی کہا کہ اب طاہر ایوب اس معاملے پر آپ کو پریشان نہیں کریں گے، اس لیے مجھے فکر مند نہیں ہونا چاہیے۔ اس بات سے میں بہت متاثر ہوا تھا، اور جب یاد کرتا ہوں تو آج بھی وہی کیفیت ہوتی ہے۔ لہٰذا مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے جب میں گندھارا انڈسٹریز کے سلسلے میں ایوب خان کے خلاف الزام تراشی سنتا ہوں، جو میرے خیال میں حقیقت پر مبنی نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایوب خان کا اس معاملے سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ یہ معاملہ جنرل حبیب اللہ کا تھا جن کی اپنی ایک حیثیت تھی۔ ان کی اپنی حیثیت تھی جس کی بنا پر جنرل موٹرز نے ان کو اس منصوبے پر بات چیت کے لائق سمجھا تھا۔ وہ خود صاحبِ حیثیت انسان تھے اور انھوں نے اپنی طرف سے سرمایہ لگایا تھا۔ مجھے بڑی حیرت ہوگی اگر جنرل موٹرز جیسا بڑا ادارہ کسی ایسے شخص سے معاملت کرے گا جس کے پاس نہ مناسب مقدار میں دولت ہوگی اور نہ اتنی بڑی صنعت چلانے کے لائق انتظامی صلاحیت۔ میرے خیال میں یہ سارا معاملہ بالکل غلط انداز میں عوام کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ یہ منصوبہ جنرل حبیب اللہ کا اپنا تھا، اتفاق سے جن کے داماد صدر ایوب کے سب سے بڑے بیٹے گوہر ایوب تھے۔ صدر بذاتِ خود بہت نفیس انسان تھے۔ اتنے عرصے کے دوران انھوں نے کبھی مجھ سے نہ اپنے لیے اور نہ اپنے دوستوں کے لیے کوئی رعایت طلب تھی۔ وہ بہت سلجھے ہوئے انسان تھے، ایک بڑے زمیندار بھی مگر ملک کے لیے بہت اچھے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ میں غلط ہوں مگر میرے احساسات کچھ ایسے ہی ہیں۔''

سعید احمد صاحب سے چالیس برس کی شناسائی کے دوران میں نے نہ صرف ان کی پیشہ ورانہ زندگی کا بغور مطالعہ کیا ہے بلکہ ایک دوست اور ایک انسان کی حیثیت سے ان کے اچھائیوں پر بھی میری نظر رہی ہے۔ جب بھی وہ اور ان کی دل موہ لینے والی شریکِ حیات یورپ آتے ان کی ہمیشہ کوشش ہوتی کہ وہ میونخ آئیں، ہم سے ملاقات کریں اور جھیل اسٹارن برگ پر واقع میرے مکان پر ہمارے مہمان ہوں۔ ان سے میل جول بہت آسان لگتا تھا اس لیے کہ اپنے اطراف وہ ایسی کیفیات پیدا کرتے تھے جو نہ صرف دوسروں کو بلکہ ان کے اپنے لیے بھی اطمینان کا باعث ہوتی تھیں۔ وہ لفظوں کا ہیر پھیر نہیں کرتے تھے، صاف صاف وہی کچھ کہتے دیتے تھے جو اُن کے دل اور اُن کے ذہن میں ہوتا تھا۔ اکثر اوقات میں نے ان کے ذہن سے ان کے وطن، پاکستان کے، جس سے وہ بہت محبت کرتے تھے، بہت سے معاشی اور سیاسی مسائل کے تجزیے اور حالات آسانی سے اخذ کر لیتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ ہم ملک کے ماضی اور مستقبل کے بارے میں طویل گفتگو کر رہے تھے۔ اتفاق سے یہ ایک دن قبل کا واقعہ ہے جب پاکستان کی پچاسویں سالگرہ منائی جانے والی تھی۔ انھوں نے اپنے خیالات کا خلاصہ پیش کیا جس کو میرے خیال میں اس لیے محفوظ کیا جانا چاہیے کہ یہ وہ انسان کہہ رہا ہے جو اس ملک کی مقتدرہ کے مرکز میں پچیس برس

تک کام کرتا رہا تھا۔ انھوں نے جو کچھ کہا وہ مندرجہ ذیل ہے:

''میرے خیال میں ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کا قومی ملکیت میں لیے جانے کا پروگرام ہماری معاشی تنزلی کا باعث ہوا تھا۔ اس سے قبل پاکستان، شاید پہلا، ''ایشین ٹائیگر'' بننے کی طرف رواں دواں تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار 'ٹائمز' میگزین کے سرورق پر احمد داؤد کی تصویر شائع ہوئی تھی، جو اس زمانے میں پاکستان کے بہت کامیاب تاجر اور صنعتکار سمجھے جاتے تھے۔ ان کو ایک صاحبِ بصیرت کاروباری اور پاکستان میں ترقی کی علامت کے طور پر جانا جاتا تھا، بین الاقوامی اعتبار سے بھی ایک بڑے کامیاب تاجر۔ بھٹو کے ظہور کی وجہ سے ان کے کاروبار کی سلطنت مکمل طور پر تباہ اور صفحۂ ہستی سے غائب ہوگئی تھی۔ اور یہ سب کچھ ایسے وقت میں ہوا جب، جیسا کہ مجھے علم ہے، وہ اپنے وطن کے فائدے کے لیے ملک سے باہر اپنے پر پھیلانا چاہتے تھے۔ اپنی بربادی کے باوجود انھوں نے ہمت نہیں ہاری تھی اور چھوٹا موٹا کام کرنے کی کوشش میں لگے رہے تھے۔

اپنی تمام تر کوتاہیوں کے باوجود، میرے خیال میں، ہم نے اچھی خاصی کامیابی حاصل کرلی ہے۔ ہمارا مستقبل بہت تاب ناک ہے، ہمیں پُر امید رہنا چاہیے۔ مگر کچھ کم زوریاں ہیں جن سے نبرد آزما ہونا پڑے گا۔ میں نے اکثر کہا ہے کہ ہر چیز میں سیاست بازی، صنعتوں میں، تجارت میں، تقرریوں میں ہر جگہ سفارش اور رسوخ ہی ہمارا مسئلہ ہے۔ یہ منفی عوامل ہیں جنھوں نے ہماری معاشیات کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے، ورنہ ملک تو اچھی طرح سے آگے بڑھ رہا تھا۔ دراصل ہمارا اوّلین مقصد وہی ہونا چاہیے تھا جو ملک کے مفاد میں ہو۔ دوسرا مسئلہ بد عنوانی ہے۔ مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ ہر طرف بدعنوانی کا راج ہے۔ ہم سب سمجھتے ہیں کہ دوسرے ملکوں میں بھی بدعنوانی ہے مگر اس کو ملک کے مفاد کے تناظر میں ایسی شائستگی سے کیا جاتا ہے کہ یہ ملکی ترقی میں معاون ہوتی ہے۔ مگر ہمارے ملک میں، ہندوستان کی طرح، بد عنوانی نجی زراندوزی کے لیے کی جاتی ہے جس سے امیر اور بھی امیر ہوجاتا ہے، ملک کو کسی قسم کا فائدہ نہیں ہوتا۔ ہماری سب سے بڑی مشکل یہی ہے۔ اور یہی خرابیوں کہ جڑ ہے جس سے ہم آج نبرد آزما ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ہم نے پاکستان میں بہت کچھ کام کیا ہے مگر قرینے سے نہیں کیا گیا۔ اس کی وضاحت کے لیے میں بینکنگ کے شعبے سے ایک عملی مثال دینا چاہوں گا جس سے میں اچھی طرح سے واقف ہوں۔ قومی ملکیت میں لیے جانے کے بعد قرضوں میں سیاست کی گئی ہے، ملازمتوں میں بھی۔ اگر ایک بینک کا کام سو افراد سے چل جاتا تو ان کو بڑھ سو افراد بھرتی کرنے کے لیے کہا گیا۔ اور ادارے کا سربراہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اتنے افراد کی ضرورت نہیں، مزاحمت نہیں کرسکا۔ میں منزل یحییٰ خان کے دور کا ایک واقعہ بیان کرنا چاہوں گا جس کا مجھے ذاتی تجربہ ہوا تھا۔ وہ اپنے شناساؤں اور پسندیدہ افراد پر مہربان ہونے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ ایک بار کراچی آئے تو انھوں نے مجھے ملاقات کے لیے طلب کیا۔ ظاہر ہے کہ میں ملنے گیا۔ وہ گورنر ہاؤس میں قیام پذیر تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا، ''سعید احمد میری ایک دوست ہیں جو ایک ٹیکسٹائل مل لگانا چاہتی ہیں۔ تمھیں ضرور ان کی مدد کرنا چاہیے، میں انھیں تمھارے پاس بھیج دوں گا۔ وہ مجھ سے ملنے آئیں اور ایسے لباس میں تھیں جو مجھے پسند نہیں آیا، مگر یہ ایک اور ہی بات تھی جس سے مجھے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میں نے ان کو درخواست دینے کے لیے کاغذات دیے اور ان سے کہا کہ وہ ان کو پُر کر کے جمع کرادیں تاکہ متعلقہ افراد اس منصوبے کی جانچ پڑتال کرسکیں۔ چند دنوں بعد وہ درخواست موصول ہوئی اور پڑتال کے بعد ہمارے کارکن اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ قابلِ عمل تجویز نہیں۔ شاید اس لیے کہ ان دنوں ملک میں بہت زیادہ ٹیکسٹائل ملیں لگ چکی تھیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کی اس کے ضمانت دینے والے افراد میں سے کچھ افراد کی حیثیت اور کردار مشکوک تھے۔ میں نے اصل وجہ نہیں بتائی تاکہ ان کی دل شکنی نہ ہو، اور صرف اتنا کہہ دیا کہ اس وقت ہمارے پاس وسائل کی کمی ہے۔ اور یہ بات صحیح بھی تھی اس لیے کہ ان دنوں ملک کے دونوں بازوؤں کے درمیان فاصلے بڑھ رہے تھے اور مشرقی پاکستان کے حالات قابو سے باہر ہوتے جارہے تھے۔ عالمی بینک اور دوسرے قرض دینے والے اداروں نے اپنے ہاتھ روک لیے تھے اور یہ کہا تھا کہ جب تک حالات دوبارہ بہتر نہیں ہوجاتے وہ مزید قرضے نہیں جاری کرسکیں گے۔